ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، لاہور

# ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ، ہائیڈل برگ یونیورسٹی، جرمنی میں موجود نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات

(توضیحی فہرست مع منتخب نصابی کتب کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں توضیحی مطالعہ)

**Dr. Nasir Abbas Nayer**

Assistant Prof. Department of Urdu,

Oriental College, Lahore

## Selected Urdu Courses available at SAI, Heidelberg University, Germany

(A STUDY OF DESCRIPTIVE BIBLIOGRAPHY IN POSTCOLONIAL SCENARIO)

This article is the part of author's postdoctoral research he conducted at Heidelberg University, Germany in 2011. The article consists mainly of descriptive bibliography of Urdu courses, available at South Asia Institute, Heidelberg University, Germany which were mostly prepared though by natives under strict restrictions of colonial administrators of British India for vernaculars schools. Furthermore, main contents of selected course books have been analysed and interpreted in postcolonial perspective. Postcolonialism, as put forwarded by Said, Bhabha and others, seeks to underpin the multilayered ideological constructions of texts produced under cultural influences of colonial power structures. The author of the article is of the view that the process of production and selection of the contents of course books got heavily influenced by the hegemonic cultural strategy of colonial rulers which can be brought to light by deconstructive and symptomatic modes of reading the texts.

---

# حصہ اوّل

پیشِ نظر اوراق میں نو آبادیاتی عہد کے ان اردو نصابات کی توضیحی فہرست اور ان میں سے منتخبہ و چیدہ کتب کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے جو مجھے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ میں اپنی پوسٹ ڈاکٹرل تحقیق کے سلسلے میں دستیاب ہوئے۔ میری تحقیق کا موضوع ''ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں موجود نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'' تھا۔اس موضوع کے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں قابلِ تحقیق ہونے کی منظوری مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کے جدید ایشیائی زبانوں کے شعبے کے سربراہ ڈاکٹر ہنس ہارڈر نے دی۔ میں نے یہ تحقیق اس شعبے کی اردو کی سینئر استاد ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی نگرانی میں مکمل کی۔ پوسٹ ڈاکٹرل فیلو شپ کے لیے مجھے جرمن تعلیمی تبادلے کی تنظیم ' (Deutscher Akademischer Austausch Dienst) نے چھ ماہ (مئی تا اکتوبر ۲۰۱۱ء) کے لیے وظیفہ دیا۔

۱۹۶۲ء میں قائم ہونے والے جنوبی ایشیا انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں جنوبی ایشیا سے متعلق پونے تین لاکھ کے قریب کتب اور رسائل موجود ہیں۔اگرچہ جنوبی ایشیا سے زیادہ تر مراد 'ہندوستان' لیا جاتا ہے اور جنوبی ایشیائی مطالعات میں مرکزیت ہندوستانی زبانوں کے ادبیات کو دی جاتی ہے ،تاہم یہاں گریجوایشن کی سطح پر اردو کی تدریس ہوتی ہے اور پرانی و نئی اردو کتابوں کی ایک معقول بھی تعداد یہاں موجود ہے۔نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات لائبریری کے اس نول کشور ذخیرے میں موجود ہیں جو بیس پچیس برس پہلے (ٹھیک سال کا تعین کوشش کے باوجود نہ ہوسکا) لائبریری میں منتقل ہوا تھا۔(اس ذخیرے میں اردو کے علاوہ، ہندی ، فارسی ،عربی اور سنسکرت کتابیں بھی موجود ہیں) میری مطلوبہ کتب چوں کہ نایاب تھیں اور زیادہ اچھی حالت میں بھی نہیں تھیں، اس لیے ان کے کیٹلاگ تیار نہیں کیے گئے ۔ یہ سب کتابیں لائبریری کے تہ خانے میں ایک جگہ ڈبوں میں بند کر کے محفوظ کی گئی ہیں۔ لائبریری کی انچارج فراؤ نکلوس مرکل یہ تمام ڈبے باری باری ریڈنگ روم میں خود پہنچا دیا کرتی تھیں ۔(وہاں درجہ چہارم کے ان ملازمین کا کوئی تصور نہیں جو 'صاحب' کو آتے جاتے سلام کا نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ ،اس کے ہر طرح کے کام کرتے ہیں۔یورپی دفاتر میں صاحب و بندہ کا امتیاز نہیں۔صاحب ہی بندہ ہوتا ہے۔) مجھے یہاں سے ۲۹ نصابی کتب دستیاب ہوئیں جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پاک و ہند (زیادہ تر یوپی اور پنجاب) کے سرکاری مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ان میں کچھ قواعد و لغت کی کتابیں ہیں؛ کچھ حساب و زراعت کی؛ کچھ مکتوب نویسی کی اور زیادہ تر مجموعہ نظم و نثر ہیں۔نو آبادیاتی عہد کی یہ نہایت اہم کتب پاکستان کی لائبریریوں میں موجود نہیں ہیں۔اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ کو محفوظ کرنے سے دل چسپی ہے نہ خود تاریخ کو سمجھنا ہمارے عمومی قومی مزاج میں شامل ہے۔ہر چند مجھے وہاں اقبال کا یہ شعر کثرت سے یاد آتا کہ

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

مگر یہ اطمینان (اور یہ اطمینان کا آخری درجہ تھا) بھی ہوتا کہ کہیں تو یہ کتب محفوظ ہیں۔میں نے اپنی فیلو شپ کے مقررہ عرصے میں ان کی وضاحتی فہرستیں تیار کرلیں اور ان کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں تجزیاتی مطالعہ مکمل کر لیا تھا۔

یہاں مختصراً دیسی (ورنیکلر) زبانوں کی تعلیم اور اردو نصابات کے مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے جواز پر چند باتیں ضروری ہیں۔

## نوآبادیاتی عہد کا نظامِ تعلیم اور اردو نصابات

برطانوی ہندوستان میں جتنی تعلیمی پالیسیاں نافذ ہوئیں،ان کی جہت اور مقصد میں کوئی بنیادی نوعیت کی تبدیلی نظر نہیں آتی،تاہم اس مقصد کے حصول کے طریقِ کار میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف تک ہندوستان میں پاؤں جمالیے تھے۔اہم سیاسی اور تجارتی کام یابیوں کے بعد کمپنی اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوئی،جسے ثقافتی غلبے کی خواہش کہنا چاہیے۔اگرچہ کمپنی اپنے تجارتی قلعوں،فوجی چھاؤنیوں،اپنے سول انتظامی دفتروں،گرجاؤں،سول لائنوں کے ذریعے بھی اپنے ثقافتی شکوہ کا اظہار کرتی تھی،مگر یہ سب اس کی امپیریل ثقافت کا ایک پہلو تھا اور فقط مرعوب کن اظہار تھا؛وہ ثقافتی غلبہ چاہتی تھی اور اس غلبے کی راہ سے اپنے سیاسی اقتدار میں وسعت اور استحکام کی خواہش مند تھی۔تعلیم اس غلبے کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ تھی۔ہندوستان کے برطانوی حکمران تعلیم کا وہی تصور رکھتے تھے جو نشاۃ ثانیہ کے دوران میں *studia humanitatis* کے نام سے معروف تھا اور جس میں ''انسانی آدمی'' یعنی *Homo humanus* اور ''حیوانی آدمی'' یعنی *Homo babarus* کی تفریق موجود تھی۔[1] تعلیم حیوانی آدمی کو اس انسانی آدمی میں منقلب کرتی تھی،جس کا تصور ریاست تشکیل دیتی تھی یا جسے ریاست درجہء اعتبار دیتی تھی۔اسی غرض سے ریاست نے تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کو اپنا ''فریضہ'' سمجھنا شروع کر دیا تھا۔کمپنی کی حکومت سے لے کر تاجِ برطانیہ کی براہِ راست حکومت تک ہندوستان میں ہمیں تین قسم کی تعلیمی پالیسیاں ملتی ہیں:مشرقی علوم کی تدریس کی پالیسی؛انگریزی علوم کی تدریس کی پالیسی اور دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم کی پالیسی۔کلکتہ مدرسہ(۱۷۸۱ء) اور بنارس کا سنسکرت کالج(۱۷۹۱ء) بالترتیب مسلمانوں اور ہندوؤں کی کلاسیکی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت کی تدریس کے لیے کھولے گئے۔''۱۷۶۵ء اور ۱۸۱۳ء کے درمیانی عرصہ میں کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا خاص مقصد سنسکرت اور عربی زبان میں روایتی علومِ شرقیہ کی ہمت افزائی ہوگیا۔''[2] کمپنی کے اربابِ اختیار یہ بات جان گئے تھے کہ مسلمان اور ہندو اشرافیہ طبقات اپنی قومی شناختیں کلاسیکی زبانوں کے ذریعے کرتے تھے اور یہی ان کی علمی زبانیں تھیں۔چناں چہ ان زبانوں کی سرپرستی سے دونوں طبقات کے بااثر طبقات کی ہمدردیاں حاصل کرنا ممکن تھا۔ہندوستان کے محدود علاقوں پر قابض ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیمی نظام کا واضح خاکہ تشکیل نہیں دیا تھا۔مسلمانوں اور ہندوؤں کی کلاسیکی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا،بڑی حد تک اس سیاسی حکمت عملی کا مظہر تھا کہ کمپنی ہندوستان کے اشرافیہ طبقات کے شناخت کے حساس معاملات میں دخل اندازی نہیں کر رہی،بلکہ ان کے تحفظ کا ذمہ اپنے سر لے رہی ہے۔

۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی تو اس میں ایک نئی شق کا اضافہ ہوا جس کی رو سے کمپنی کے لیے لازم ہوا کہ وہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہندوستانیوں کی تعلیم پہ خرچ کیا کرے۔جس کا واضح مطلب تھا کہ اس نے ''شناخت کے حساس معاملات میں عدم مداخلت'' کی پالیسی پر نظرِ ثانی کی ہے؛اور در پردہ مطلب یہ تھا کہ اپنے مقبوضات کے تعلیمی نظام کو کمپنی اپنے ہاتھ میں لے لے۔اس شق سے جڑا یہ لازمی سوال کہ ہندوستان کا تعلیمی نظام کیا ہو،چارلس گرانٹ پہلے ہی اٹھا چکا تھا۔چارلس گرانٹ نے ''۱۷۹۰ء میں...برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کا نقشہ کچھ ایسا کھینچ کر دکھایا کہ جیسے ہندوستانی جاہل اور وحشی لوگ ہوں۔اس نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرے۔نیز انھیں مغربی علوم،سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ عیسائیت کی تعلیم دے اور اس مقصد کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے ساتھ

انگریزی زبان و ادب کو بھی نصاب میں شامل کرے۔''[۳] چارلس گرانٹ کے خیالات ،نشاۃِ ثانیہ کے یورپی تصوراتِ تعلیم کی سادہ اور کسی قدر خام تفسیر تھے۔آ گے چل کر ہندوستانیوں کی تعلیم کا مسئلہ جب بھی نوآبادیاتی آقاؤں کے زیرِ غور آیا،اس کی بنیاد میں یہ قضیہ لازماً شامل رہا کہ ''ہندوستانی جاہل اور وحشی ہیں اور ان کو مہذب بنانے کا واحد طریقہ انگریزی تعلیم اور یورپی ثقافت کی ترویج ہے۔'' دس برس تک کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے مختص رقم خرچ نہیں کی۔

چارلس گرانٹ کے مئوقف میں جو بات ایک خیال کی سطح پر تھی تھا،وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں ایک زوردار نظریے میں بدل گئی۔ میکالے۱۸۳۴ء میں حکومت ہند کے نئے رکن قانون کی حیثیت سے مدراس میں وارد ہوا اور اسے مجلس تعلیمات عامہ کا صدر بنایا گیا۔ اس نے ۱۸۳۵ء کی تعلیمی رپورٹ میں یہ قطعیت سے لکھا کہ کمپنی کو اپنا تعلیمی بجٹ صرف اور صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے اور کمپنی کو روایتی و مقامی مدارس کی مالی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ میکالے نے دھمکی دی تھی کہ اگر اُس کی تجاویز پر عمل نہ کیا گیا تو وہ مجلس تعلیمات عامہ سے استعفا دے دے گا۔ یہ دھمکی کارگر رہی اور ۱۸۳۵ء سے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا۔اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ انگریزی نظامِ تعلیم ایک نئی ہندستانی اشرافیہ پیدا کرنے کی غرض سے رائج کیا گیا۔ جو باہر سے ہندوستانی،مگر اندر سے انگریز ہو۔[۴] نئی ہندستانی اشرافیہ کی دوغلی شخصیت نوآبادیاتی ضرورت تھی۔ باہر سے ہندستانی ہونے کی وجہ سے، وہ انگریز حکم رانوں کے یہاں برابری کا رتبہ نہ پا سکے اور اندر سے اینگلو ہونے کے سبب وہ ہندستانیوں میں خود کو اجنبی محسوس کرے، نیز اس کی منقسم شخصیت کا داخلی رُخ خود اپنے ہم نسلوں، اپنی روایت اور اپنے ماضی سے منقطع ہی محسوس نہ کرے، اُس سے حقارت کا رویہ بھی اختیار کرے۔ اپنے ماضی سے انقطاع کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو بدیسی علوم، اقدار اور طرزِ فکر سے پُر کرے۔میکالے کے بہنوئی چارلس ٹریویلین نے ۱۸۳۸ء میں ہندوستانیوں کی تعلیم سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ۔سیاسی طور پرانگریزوں کے غلام ہندوستان پر یورپی ثقافتی غلبے کی کوششوں کو سمجھنے کے لیے ٹریولین کی کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ٹریولین کا خیال ہے کہ غلام ہندوستان کے پاس آزادی حاصل کرنے کے دو راستے ہیں: انقلاب اور اصلاح۔ انقلاب کے ذریعے فقط ایک ماہ میں ''مرہٹہ یا اسلامی حکومت قائم کی جاسکتی ہے (یاد رہے ابھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انیس برس باقی تھے) اور اصلاح کے ذریعے ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک صدی درکار ہوگی۔(یہ پیش گوئی حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی)ٹریولین یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو وہ اپنے ماضی کی طرف پلٹ جائیں گے،یعنی اپنے کلاسیکی علوم کی طرف متوجہ رہیں گے اور اپنے احیا کی متشددانہ کوششیں کریں گے اور اس راہ میں حائل ہونے والے یورپی ثقافتی اثرات کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ لہٰذا ٹریولین نے انگریزی زبان و ادب کی تدریس کی پر زور حمایت کی۔'' ہندوستانی نوجوان ہم سے ہمارے ادب کے ذریعے مانوس ہونے کے بعد ہمیں غیر ملکی سمجھنا ترک کر دیتے ہیں ۔وہ ہماری ہی طرح ہمارے عظیم لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ یکساں طریقے سے تعلیم حاصل کرنے ،یکساں باتوں میں دل چسپی لینے ،یکساں مشاغل میں ہمارے ساتھ مصروف ہونے کے بعد ہندوؤں[ہندوستانیوں] سے زیادہ انگریز بن جاتے ہیں۔''[۵] اگرچہ انگریزی تعلیم کی حمایت،مشرقی علوم کی تعلیم کی مخالفت کے مترادف تھی اور میکالے کو اپنی تعلیمی رپورٹ منظور کرانے میں مشرقی علوم کی تدریس کے ہم وطن حامیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا،مگر دونوں انگریزی سیاسی استحکام اور ثقافتی تغلب کے نکتے پر متفق تھے،بس طریقِ کار کا فرق تھا۔ایک اور بات بھی دونوں میں مشترک تھی۔دونوں ہندوستان کے اشرافیہ طبقے کی تعلیم کے حامی تھے۔شرق شناس موجود اشرافیہ طبقے کی ہمدردی کے خواہاں تھے اور

انگریزی پسند ایک نیا اشرافیہ طبقہ (کالے انگریز) تخلیق کرنا چاہتے تھے۔اس تعلیمی پالیسی میں ایک نیا موڑ ۱۸۵۴ء میں چارلس ووڈ کے مشہور تعلیمی مراسلے کی مدد سے آیا۔

اس مراسلے کی اہم سفارشات میں ایک تو ہر صوبے میں محکمہ تعلیم کا قیام شامل تھا؛ دوسرا اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اب تک اعلیٰ طبقے کی تعلیم پر توجہ دی گئی ہے،آئندہ عام لوگوں کی تعلیم پر توجہ دی جائے؛تیسرا انگلستان کی طرز پر ہندوستان میں بھی اساتذہ کے تربیتی ادارے قائم کیے جائیں۔[۶] عام لوگوں کی تعلیم پر زور دینے کا مطلب دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی طرف پیش قدمی تھا۔یہ پیش قدمی ،کلاسیکی زبانوں کومزید پس منظر میں دھکیلتی تھی مگر انگریزی کے اجارے کو گزند پہنچانے کا شائبہ تک نہیں رکھتی تھی۔لہٰذا انگریزی تعلیم برابر جاری رہی۔۱۸۸۲ء میں سر ولیم ہنٹر کی سربراہی میں قائم ہونے والے انڈین ایجوکیشن کمیشن نے دیسی زبانوں کو پرائمری اور ثانوی جماعتوں میں ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش برقرار رکھی۔لہٰذا دیسی زبانوں میں نصابات کی تیاری ۱۸۵۴ء کے تعلیمی مراسلے کے بعد شروع ہوئی۔یہ الگ بات ہے کہ یہ سارا عمل بے حد سست رفتاری سے ہوا۔

برطانوی ہندوستان کا نظامِ تعلیم اشرافیہ کی سطح پر انگریزی اورعوام کی سطح پر ورنیکلر اور انگریزی سے بہ یک وقت عبارت تھا۔ انگریزی تعلیم کی کیا جہت تھی؟ اس کا جواب ہمیں ''ایشیاٹک ریویو''میں شامل پنڈت شیام شنکر کے ایک مقالے سے مل جاتا ہے۔ پنڈت شیام نے ۱۸۵۷ء کے یونیورسٹی ایکٹ میں درج یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' یونیورسٹی کے قیام کا مقصد تعلیم نہیں، بلکہ جانا یا فن تھا...ہندوستانی جامعات بنیادی طور پر تعلیم دینے کے لیے نہیں،جیسا کہ ہم عموماً اس اصطلاح کا مطلب لیتے ہیں،یعنی جسمانی،ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کی متناسب نشوونما۔''[۷] اسی رسالے(جس کا ابتدا میں نام'' دی امپیریل اینڈ ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو'' تھا )کے چند سال پہلے کے شمارے میں جے کنیڈی کا مضمون'' انڈین ایجوکیشن پالیسی'' شائع ہوا تھا۔کنیڈی انگریزی اور ورنیکلر تعلیم کے اہداف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' اگرچہ [انگریزی]تعلیم یافتہ مقامی لوگوں کے لیےلنگوا فرینکا ہے،مگر اس کا مطالعہ مقصودِ بالذات نہیں، بلکہ یہ اس لیے سیکھی جاتی ہے کہ یہ سرکاری ملازمت کی بنیادی اہلیت ہے...ورنیکلر تعلیم بھی سرکاری ملازمت کے نچلے عہدوں کے لیے درکار ہے۔''[۸] اگرچہ انگریزی اور ورنیکلر تعلیم میں وہی طبقاتی امتیاز قائم کیا گیا جو انگریز اور ایک عام ہندوستانی میں موجود تھا،مگر دونوں کا مقصود ایک ہی تھا: سرکاری کارندے پیدا کرنا۔تعلیم کو انسان کی بہترین ذہنی صلاحیتوں کی دریافت ونمو اورفطری روحانی صلاحیتوں کی ترقی سے الگ کر کے چندٹکوں کی سرکاری نوکری کا وسیلہ بنانے میں استعمار کو کئی مقاصد حاصل ہوتے تھے۔سب سے بڑا مقصد یہ حاصل ہوتا تھا کہ سرکاری ملازمت ہندوستانیوں کو استعماری نظام کی کل کا پرزہ بنا دیتی تھی اوروہ اس کے خلاف احتجاج و مزاحمت کا حق کھو دیتے تھے۔ استعماری کل کا پرزہ بننے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی یورپی تہذیب اور اس کے مظاہر کی مدحت کے جذبات اپنے دل میں پیدا کریں۔یہ سب مخصوص طرز کے نصابات کے ذریعے ممکن تھا۔لہٰذا نصابات کی تیاری میں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا۔

عظیم فکری اورتہذیبی تبدیلیاں دیسی زبانوں کی ترقی کی مرہون ہوتی ہیں۔جدید یورپ کے تہذیبی انقلاب کوممکن بنانے میں وہاں کی ورنیکلر زبانوں کا سب سے اہم حصہ ہے:کلاسیکی لاطینی اور یونانی کی جگہ جب انگریزی،جرمن،فرانسیسی،اطالوی،ہسپانوی وغیرہ نے لی اور ان میں کلاسیکی پائے کے ادبیات کی تخلیق ہوئی اور انھیں جدید علوم کی زبانیں بنایا گیا۔لہٰذا نوآبادیاتی برصغیر میں بھی اس

بات کا امکان تھا کہ دیسی زبانوں کی سرپرستی سے 'ایک عظیم فکری وتہذیبی انقلاب' برپا ہو،مگر ایسا نہیں ہوا۔ یورپ کو ایک آفاقی مثال کے طور پر پیش کرنے کے باوجود برصغیر میں یورپ کی تاریخ نے یہاں خود کو نہیں دہرایا۔اکثر مستشرقین اردو کے لیے انگریزی کو اس درجے کا حامل سمجھتے تھے جو لاطینی و یونانی کا انگریزی کے لیے تھا اور یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ جس طرح لاطینی و یونانی نے ورنیکلر انگریزی کو ثروت مند کیا ،اسی طرح انگریزی ،اردو کو بیش بہا فائدہ پہنچائے گی۔اسی خیال سے اردو کے نصابات میں 'انگریزی روح' بھرنے کی کوشش کی گئی۔نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات کی 'روحِ رواں' انگریزی فکر ہے، انگریزی ادبی شعریات بس کہیں کہیں، ادھورے انداز میں جلوہ دکھاتی ہے۔چوں کہ نصابات کی ترتیب کا بنیادی محرک 'سرکار کی کل کے پرزے' تیار کرنا ہے،لہٰذا وہ فکری و تہذیبی انقلاب ممکن نہیں تھا،جو انسان کے طبعی،ذہنی اور اخلاقی قوا کی متناسب نشوونما کا رہینِ منت ہے۔

## مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کیوں؟

ان نصابات کے مابعد نو آبادیاتی مطالعے کا خیال مجھے دو وجوہ سے آیا۔ایک وجہ تو بڑی حد تک شخصی ہے؛میں ان مابعد نو آبادیاتی مطالعات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا جو میں گزشتہ کچھ عرصے سے کررہا ہوں اورجن کا ارتکاز اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردوادب پر ہے۔دوسری وجہ یہ احساس تھا کہ نو آبادیاتی عہد میں کوئی ثقافتی سرگرمی اس جمالیاتی عمل میں تبدیل نہیں ہوتی جو'بے غرض، بے لوث اور مقصودِ بالذات' ہوتا ہے۔لہٰذا استعماری تناظر میں تعلیم 'بے غرض ، بے لوث' نہیں ہوتی ؛تعلیمی نصابات ،نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کے اظہار واستحکام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ان نصابات کے مطالعے سے میرا یہ احساس مزید پختہ ہوا کہ استعمار کار کی مٹھی میں بند نو آبادیاتی ثقافت کی روح اس خیال ہی سے کانپتی ہے کہ وہ محکوم،نیٹوز کی تعلیم کو ایک آزادفکر انسان کی نشوونما کا ذریعہ بنائے۔نو آبادیاتی نظامِ تعلیم کے مقاصد میں دور دور تک یہ مقصد شامل نہیں ہوتا کہ وہ ایک آزادفکر،اپنی تقدیر کا فیصلہ خود اپنے ثقافتی وسائل اور نفسی آزادی سے کرنے والے انسان کی ذہنی نشوونما کو ممکن بنائے۔

مابعد نو آبادیات اپنی ابتدائی اور عمومی صورت میں،یورپی نو آبادیات کے ثقافتی اثرات کا مطالعہ ہے۔یہ اثرات تاریخ، معاشرت،ادب،فن ،زبان اور ان سب کے مطالعات پر مرتب ہوئے۔لہٰذا ''مابعد نو آبادیات [ کی اصطلاح]اب ان وسیع اور متنوع طریقوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کے تحت یورپی مفتوحہ علاقوں،یورپی نوآبادیات کے مختلف اداروں،ایمپائر کے کلامیوں، نوآبادیاتی ڈسکورس میں موضوع [محکوم کی ذات کے تصور] کی تشکیل اور ان محکوموں کی مزاحمت اور غالباً سب سے اہم ان مداخلتوں کے جواب میں [محکوموں کے]متضاد ردِاعمال کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے اورقوموں اور گروہوں کی ان معاصر کولونیل وراثتوں کا[مطالعہ]جو آزادی سے قبل اور مابعد موجود ہوتی ہیں۔''[۹]

مابعد نوآبادیات کے جن متنوع طریقوں کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے،ان میں میشل فوکو کا کلامیے یاڈسکورس کا نظریہ،التھیو سے کے نو مارکسی اور لاکان کے ساختیاتی نفسیاتی نظریات اور دریدا کی ساخت شکنی شامل ہیں جنھیں بالترتیب ایڈورڈ سعید،ہومی کے بھابھا اور گیاتری چکر ورتی نے استعمال کیا ہے۔ان متنوع طریقوں میں یہ اصول قدرِمشترک کا درجہ رکھتا ہے کہ کوئی ثقافتی سرگرمی ایک خود مختار اکائی نہیں ہوتی؛وہ معنی خیزی کا ایک ایسا نظام ہوتی ہے جس کے معنیاتی ڈانڈے دوسرے ثقافتی اعمال سے ملتے ہیں۔لہٰذا اس کا مطالعہ،ان معنیاتی ڈانڈوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر ممکن نہیں جو اکثر مخفی،تہ نشین صورت میں موجود ہوتے ہیں اورجن میں یہ صلاحیت

ہوتی ہے کہ وہ ایک ثقافتی و ادبی متن کے ظاہری معنی کو اتھل پتھل کر سکتے ہیں ۔کوئی متن بہ ظاہر جس معنی کا حامل ہوتا ہے،اسے غیر مستحکم کرنے کا سامان خود اسی متن میں موجود ہوتا ہے۔میشل فوکو نے کلامیے کو طاقت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ایڈورڈ سعید کی کتاب ''شرق شناسی'' جو مابعدنوآبادیاتی مطالعات میں بائبل کا درجہ رکھتی ہے،اس میں سعیدزور دے کر کہتا ہے کہ ''میرا موقف ہے کہ شرق شناسی کو ایک کلامیے [فوکو کا نظریہ] کے طور پر معرضِ تجزیہ میں لائے بغیر کوئی شخص اس حد درجہ منظم ڈسپلن کو ممکنہ طور پر سمجھ نہیں سکتا جس کے ذریعے یورپی ثقافت،مشرق کو سیاسی،عمرانیاتی،عسکری،نظریاتی،سائنسی اورتخیلی طور پر زیرِ انتظام لانے اور'پیدا' کرنے کے قابل ہوئی۔''[۱۰] سادہ لفظوں میں نوآبادیاتی تاریخ کا وہ سارا پیچیدہ عمل اسی وقت پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے جب ہم اس کا مطالعہ ایک کلامیے کے طور پر کریں؛ یہ تسلیم کریں کہ مغرب نے مشرق کا جو علم پیدا کیا وہ خالص علم نہیں تھا؛وہ سیاسی اور آئیڈیالوجیکل تھا،طاقت اور اجارے کے اغراض سے ملوث تھا اور یہ اغراض خوداس علم کی تشکیل کے عمل میں سرایت کر گئی تھیں۔شرق شناسی بھی ایک متن ہے،جس کا ظاہری معنی ایک خالص و بے ریا علم کا ہے،مگر اس کی تہ میں اس معنی کو مسترد کرنے کا سامان موجود ہے؛علم کے ذریعے طاقت کی خواہش،اس علم کے بیرون موجود نہیں ہوتی،خود اس علم کی ہیئت میں مضمر ہوتی ہے۔مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'طاقت بذریعہ علم' کی خواہش بے نقاب کرتا ہے۔

یہاں تفصیل سے مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے حدود و امتیازات کو واضح کرنا ممکن ہے نہ مناسب ۔تاہم اس مطالعاتی طرز کی دو اہم خصوصیات کی نشان دہی ضروری ہے۔یہ دونوں خصوصیات مذکورہ بالا نظریات کی اطلاقی شکلیں ہیں:ساخت شکن قرأت اور آثاریاتی (Symptomatic) قرأت۔ان نصابات کے مطالعے میں انھی کو بروے کار لانے کی سعی کی گئی ہے۔

ساخت شکن قرأت کے ضمن میں ''دریدا کا نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی بیان میں معنی کا اثر بے شمار متبادل معانی سے اس کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔''[۱۱] یعنی کسی متن کا معنی اس فرق سے پیدا ہوتا ہے جو اس نے دوسرے معانی سے قائم کر رکھا ہے؛معنی کی کوئی حتمی بنیاد نہیں،فرق ہی معنی کی بنیاد ہے اور یہ بھی حتمی نہیں۔مثلاً مشرق کا معنی مغرب کے معانی کے فرق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ دونوں میں معانی کی کثرت ہے ۔مشرق اور مغرب،دونوں کے ایک سے زائد معانی ممکن ہیں ۔ان کا کوئی ایک معنی یا معانی کا کوئی ایک مجموعہ دونوں کے فرق سے'طے' ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ فرق ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے؟اسی سوال کی شاخ پر مابعد نو آبادیاتی مطالعے کا پھول کھلتا ہے۔یہ فرق پیدا کیا جاتا ہے ۔یہاں پیدا کرنے کا وہی مفہوم ہے جو مارکسی فکر میں ہے:ہر پیداواری عمل میں پیداوار کے ذرائع اورطریقے شامل ہوتے ہیں۔شرق شناسی میں مشرق کا علم ،مغرب سے اس کے اس فرق سے پیدا کیا جاتا ہے جو حقیقتاً دونوں میں موجودنہیں۔یہ فرق علم پیدا کرنے کے ذرائع (مستند کلاسیکی مشرقی متون،زبانی روایات کے تحریری متون) اورطریقوں (قرأت وتعبیر کے طریقے ،علمیات وغیرہ) پر مغرب کے اجارے سے پیدا کیا جاتا ہے۔اجارے کا ایک مطلب ، اظہار و ابلاغ کے وسائل پر ایک ایسا غلبہ بھی ہے جو استعمار کے لیے ممکن بناتا ہے کہ وہ مشرق کی ترجمانی کر سکے اور خودمشرق'خاموش' ہو جائے۔اجارہ اس بات کو بھی ممکن بناتا ہے کہ مشرق اگر اپنی خاموشی کو توڑنے کا اعلان کرتا ہے تو اس کی گویائی میں بھی خیال، لحن،اسلوب،تصور مغرب کا ہوتا ہے۔یہ اجارے کی گہری نفسیاتی صورت ہوتی ہے ۔تاہم دونوں صورتوں میں مشرق اپنے اصل اور حقیقی اظہار کے سلسلے میں خاموش ہوتا ہے۔ساخت شکن قرأت کے ذریعے مشرق /ایشیا/برصغیر کے یورپی علم اور اس کے اجارہ داری کی متنوع صورتوں کی کنہ تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح نو آبادیاتی متن کے دعوے کی تردید خود

اس متن کی تہ میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً نو آبادیاتی عہد میں تصنیف ہونے والی اکثر کتابوں میں انگریزی زبان، یورپی علوم اور یورپی تہذیب کو ''مہذب بنانے'' کی قوتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؛ انگریزی زبان اور یورپی علوم پر دسترس، مہذب ہونے کی علامت بن جاتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان بجائے خود مہذب یا غیر مہذب نہیں ہوتی؛ اظہار و ابلاغ کی بنیادی و لازمی سطح پر تمام زبانیں یکساں درجے کی حامل ہیں اور سب زبانوں میں اظہار کے مہذب و غیر مہذب پیرائے موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی کے مہذب ہونے کا دعویٰ اپنی اصل میں لسانی نہیں، لسانی استعماریت کی خاطر ہوتا ہے تو اس دعوے کی تردید خود اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ نیز ایک زبان کے مہذب ہونے پر اصرار، دوسری زبان یا زبانوں کو سماجی عمل، تہذیبی دائرے اور علمی دنیا سے باہر رکھنے کی تدبیر ہے۔

جہاں تک آثاریاتی قرأت کا تعلق ہے، اسے التھیو سے نے 'قرأت کی مذہبی متھ' کے مقابلے میں پیش کیا ہے۔ قرأت کی مذہبی متھ دنیا کو ایک قسم کا مقدس صحیفہ سمجھتی ہے جو سچائی کے ساتھ ہم سے کلام کرتا ہے۔[۱۲] مقدس صحیفے کے مطالعے کا مطلب ایک واضح اور کھلی صداقت تک پہنچنا ہے۔ اس کے مقابلے میں آثاریاتی قرأت واضح علامات کی مدد سے اوجھل صداقت تک پہنچتی ہے۔ آثاریاتی قرأت تحلیل نفسی کے مماثل ہے۔ جس طرح تحلیل نفسی میں مریض کی علامات [خوابوں، زبان کی لغزشوں] کا مطالعہ کر کے اس کے لاشعور تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح آثاریاتی قرأت کا ''بنیادی قضیہ یہ ہے کہ ظاہری متن کی تہ میں ایک دوسرا متن موجود ہے جو معصومانہ قرأت کے تابع نہیں۔ یہ دوسرا متن 'پہلے متن کے لازمی غیاب کی موجودگی' ہے اور اس کی خاموشی اور ان کہی اتنی ہی پر از مطلب ہے جس قدر ظاہری متن ہے۔''[۱۳] مابعد نو آبادیاتی مطالعہ 'ظاہری متن کی تہ میں موجود خاموش متن' کے مطالب کی تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر محض کسی لفظ کی استعاراتی گرہوں کو کھولنے کا عمل نہیں۔ نو آبادیاتی متن کا مرکز استعماری اجارے کی آماج گاہ ہوتا ہے اور وہ محکوم و استعمار زدہ آوازوں کو خاموش کرتا اور حاشیے پر دھکیلتا ہے؛ آثاریاتی قرأت استعماری اجارے کو منسوخ کرنے کا اقدام کرتی ہے۔[۱۴] دوسرے لفظوں میں اوپر متن کی جس خاموشی و ان کہی کا ذکر ہوا ہے وہ دراصل استعمار کی محکوم ثقافت پر مسلط کردہ خاموشی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ اس پر از مطالب خاموشی کی تعبیر کرتا ہے۔

مابعد نو آبادیات کے اسی نظری فریم ورک کو کم یا زیادہ اردو نصابات کے مطالعے میں بنیاد بنایا گیا ہے۔

یہاں دو ایک اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے جو دراصل اس مطالعے کے حدود سے متعلق ہیں۔ ان نصابات میں شامل نظم و نثر کا اسلوب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ان کتب میں سے بعض، بچوں کے ادب کے طور پر خصوصی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ یہ دونوں پہلو مابعد نو آبادیاتی مطالعے کے حدود سے باہر ہیں، لہٰذا ان کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔

## حوالہ جات


۱۔ لیلا گاندھی، Postcolonial Theory، ایڈنبرا، ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء، ص ۴۵

۲۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر، پاکستان میں تعلیم: ایک تحقیقی جائزہ، لاہور پاکستان کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۷۸

۳۔ ایضاً، ص ۷۹

۴۔ شبیر بخاری، سید، میکالے اور برصغیر کا نظامِ تعلیم، (یادداشت، حواشی و تعلیقات)، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۶۵

۵۔ چارلس ٹریولین،On The Education of the People of India،لندن،لانگ مین ،ارمی براؤن ،گرین اینڈ لانگ میز،۱۸۳۸ء،ص ۴۵

۶۔ انجم رحمانی،ڈاکٹر، پاکستان میں تعلیم: ایک تحقیقی جائزہ،ص۸۳

۷۔ پنڈت شیام "The problems of Education in India"مشمولہ The Asiatic Review،جلد ہفتم، جولائی تا نومبر ۱۹۱۵ء ص ۴۰۱۔۴۰۲

۸۔ جے کنیڈی ، Indian Education Policy، مشولہ The Imperial and Asiatic Quarterly Review، جلد ۱۹، جنوری تا اپریل ۱۹۰۵ء ص۴

۹۔ بل اشروفت، گیرتھ گرفتھس ،ہیلن ٹیفن، Post-Colonial Studies:The Key Concepts،لندن و نیویارک، روٹلیج ،۲۰۰۷ء(۲۰۰۰ء) ص ۱۶۹

۱۰۔ ایڈورڈ سعید، Orientalism،انگلینڈ، پنگوئن بکس،۱۹۹۵ء(۱۹۷۸ء)،ص ۳

۱۱۔ ایم ایچ ابرام، A Glossary of Literary Terms،نیو یارک،سی بی ایس پبلشنگ جاپان،۱۹۸۷ء ص ۳۹

۱۲۔ لیوک فریٹر، Louis Althusser،اوکسفرڈ،روٹلیج ، ۲۰۰۶ء،ص ۵۲

۱۳۔ مریم گلوکسمان، Structuralist Anlysis in Contemporary Social Thought،لندن،روٹلیج و کیگن پال،۱۹۷۴ء،ص ۳

۱۴۔ بل اشروفت، گیرتھ گرفتھس ،ہیلن ٹیفن، The Empire Writes Back،لندن و نیویارک، روٹلیج ،۲۰۰۲ء(۱۹۸۹ء) ص ۸۲

**مبادی الحساب: حصہ دوم**

**پنڈت بنسی دھر با اعانت پنڈت موہن لعل**

**تعداد صفحات :۶۶**

**الہٰ آباد گورنمنٹ پریس، بار پنجم،۱۸۷۰ء**

کتاب کے سرورق پر وضاحت کی گئی ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے حکم پر یہ کتاب تصنیف ہوئی اور اسے گنت پرکاش کے دوسرے بھاگ سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ چوں کہ یہ کتاب مبادی الحساب ہی کا دوسرا حصہ ہے اس لیے اس میں حساب کی ان مبادیات کو پیش کیا گیا ہے، جو پہلے حصے میں نہیں تھیں اور جن کی ضرورت ابتدائی درجوں کے بعد ہوتی ہے۔ اس میں قاعدہ اربعہ متناسبہ، کسور عام ،قاعدہ ضرب کسور، کسور اعشاریہ، جذر کی وضاحت کی گئی ہے؛ مثالیں دی گئی ہیں اور ہر 'باب' کے آخر میں مشقیں بھی دی گئی ہیں۔

**مبادی الحساب منظوم**

**بابو گوبند سہائے**

**تعداد صفحات :۱۱۴**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، مرتبہ اوّل، ستمبر ۱۸۷۹ء**

بابو گوبند سہائے (وکیل علی گڑھ) نے یہ کتاب ،راجہ جے کشن داس ،ڈپٹی کلکٹر کان پور کی تحریک و ارشاد پر تصنیف کی۔ یہ اپنی طرز کی انوکھی کتاب ہے کہ اس میں حساب کی تمام مبادیات کو منظوم پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ۔کلامِ موزوں نہ صرف انسانی

یادداشت میں سرعت سے جگہ بنانے میں کام یاب ہوتا ہے بلکہ سامعی حظ بھی بہم پہنچاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان کے ابتدائی تخیلی اور عقلی اظہار کا پیرایہ شاعری رہا ہے ۔تاہم یہ کتاب شاعری کی نہیں،سائنس کی ہے۔اس میں شاعری کی قوت کو ایک عملی نصابی ضرورت کے لیے بروے کار لایا گیا ہے۔ مئولف نے متاثر کن قدرتِ کلام کا مظاہرہ کرتے ہوئے ،حساب کی تمام اصطلاحات کو اردو میں ڈھالا ہے۔کتاب میں عمل تنصیف،عمل تضعیف،عمل جمع،عمل مرکب،عمل تفریق،عمل تفریق مرکب،عمل ضرب وعمل ضرب مرکب،عمل قسمت وتقسیم مرکب،عمل اربعہ متناسبہ مع مثال مطلوب وعمل ستہ متناسبہ،عمل کسور، اقسام کسور عام،تشریح کسور عام،تحویل کسور عام،قاصد اختصار کسور،قاعدہ کسر مرکب،کسور اعشاریہ،تفریق،ضرب،تقسیم،سلسلہ جمع وتفریق و تناسب،قواعد مفید،سلسلہ ضرب وتقسیم وغیرہ کی تعریف، وضاحت اور طریقہ سب شعری پیرائے میں ہیں اور ہر ایک کے ساتھ مثالیں بھی موجود ہیں۔علم قسمت کی شعری پیرائے میں وضاحت ملاحظہ ہو:

یہ سمجھ لے قاعدہ تقسیم کا — کچھ عدد ایک سطر میں کر بے پیا
نام ان کا جان مقسوم اور نیا — گرد ان کے دو خط کج اے فنا
زیر خط جانب چپ دو عدد — لکھ جو مقسوم علیہ ہے نام زد
اس طرح جب عدد ہو ویں وقوع — جانب چپ سے تو قسمت کر شروع
اور ہوں مقسوم علیہ کے جو عدد — اتنے ہی مقسوم سے لے کر اسد
دیکھ پھر مقسوم سے یہ اے صنم — کے دفعہ مقسوم ہووے گا کم

یہ کتاب ایک طرف مؤلف کی قدرت کلام کی شاہد ہے اور دوسری طرف اردو زبان کی وسعت اظہار پر گواہ ہے ۔نیز حساب کی اصطلاحات،کلیوں اور طریقوں کو آسان اردو زبان میں منتقل کرنے کی جس صلاحیت کا مظاہرہ ہوا ہے وہ الگ داد طلب ہے۔

**چمنستان تعلیم**

**مولوی عبدالعزیز آروی**

**تعداد صفحات : ۲۸**

**مطبوعہ نول کشور، کان پور، جون ۱۸۹۰ء**

یہ کتاب سورج مل کی فرمائش پر مبتدی طالب علموں کو اردو کے ذریعے فارسی کی تعلیم دینے کے لیے تالیف کی گئی ؛چناں چہ ذولسانی کتاب ہے۔دائیں ہاتھ اردو فقرات اور ان کے مقابل انہی کے فارسی تراجم دیے گئے ہیں۔کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق اور حکیمانہ نکات کی تعلیم بھی مؤلف کے پیش نظر ہے۔مثلاً پر کٹ کبوتر کو بلی دیکھتی ہے: کبوتر پر بریدہ را گربہ می بینند۔اسی طرح بعض جملے انیسویں صدی کے آخر کی سیاسی سماجی صورتِ حال کا رمزیہ اظہار معلوم ہوتے ہیں،جیسے:ادھر ادھر سے جمع کرتا ہوں اور تم اپنے گھر لے جاتے ہو:از ہر سو جمع مینایم وشما بخانہء خویش برید۔مطبع نول کشور کے مصحح مولانا حامد علی خاں نے کتاب کی تاریخ طباعت لکھی ہے اور اسی میں کتاب کی غرضِ تصنیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

عزیز نامور نے یہ رسالہ — لکھا ہے مبتدی لڑکوں کی خاطر
لکھو حامد یہ تم بھی مصرع طبع — بہار بوستاں فکر عاطر

**مکتوبات حسن**

**مولانا ابوالحسن**

**تعداد صفحات :۱۳۰**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، باراوّل، جنوری ۱۸۹۱ء**

مولانا ابوالحسن آگرہ کالج میں عربی و فارسی کے مدرس اوّل اور پنشن یافتہ تحصیل دار تھے۔خط شکستہ میں لکھی گئی اس کتاب کو ''واسطے استفادہ ہرقسم کی انشا پردازی ومضمون نگاری عام طلباء مکاتب و مدارس ہندوستان کے''تصنیف کیا گیا تھا۔کتاب کے آغاز میں مختصر دیباچہ ہے، پھر تقطیع ہے یعنی خط نستعلیق کی خط شکستہ میں تقطیع کی گئی ہے۔اس کے بعد ۱۱۸ خطوط ہیں۔

مصنف نے دیباچے میں وضاحت کی ہے کہ'' سبب تالیف اس کتاب کا یہ ہے کہ سررشتہ تعلیم میں ایک کتاب بنام مکتوب احمد ہے جو مدت سے جاری ہے، بخط شکستہ اور خطوط ہر قسم کے مضامین کے درج ہیں۔ اس سے سررشتہ تعلیم کو بھی فائدہ پہنچا اور طلبہ مدارس کو خط شکستہ اور تحریر بد خط پڑھنے کا ملکہ ایسا ہی حاصل ہوا جو ویسے مکاتب میں مکتوب ،خطوط کے پڑھنے سے ہوتا تھا اور اس کو چھوٹے بڑے یارآشنا کے القاب وآداب کا بھی فائدہ ملا۔اگرچہ خیال کیا گیا ہے کہ اس میں مضامین معمولی اور رسمی روزمرہ کے ہیں....راقم نے یہ کتاب بنام مکتوبات حسن تصنیف کی جس میں خط شکستہ ہے اور القاب وآداب چھوٹے بڑے،یاروآشنا،واحباب و استاد و شاگرد ...جو خطوط ہیں بالاختصار درج ہیں اور اس میں اور مکتوب میں ایک بڑا تفاوت یہ ہے کہ اس تالیف میں کوئی خط خالی از مضامین پند و نصائح نہیں اور طریق تعلیم و تادیب نہیں ہے اور سررشتہ ءتعلیم میں ایسی ہی کتاب کی ضرورت اور حاجت تھی۔'' لہٰذا اسے سرکاری نصابی کتاب کے طور پر تو رائج نہیں کیا گیا تھا،مگر مدارس کے طلبا اضافی کتاب کے طور پر پڑھ لیتے ہوں گے۔

ہر خط کسی خاص موضوع / مضمون پر ہے؛ جیسے تحصیل علم کے فضائل،ایران و ہندوستان کی فارسی،فارسی اشعار کی شرح،بورڈنگ ہاؤس کے قواعد، عالم باعمل،وقت کا ضیاع،ظرافتِ بے مقصد وغیرہ؛ تاہم کچھ مضامین اس عہد کی ثقافتی اور ادبی صورتِ حال سے متعلق مقامی طرزِ فکر سے آگاہ کرتے ہیں۔یہ کتاب حالی کے مقدمے سے دو برس پہلے شائع ہوئی تھی،مگر حیرت انگیز طور پر اس میں اردو شاعری پر وہی اعتراضات ملتے ہیں جو حالی کے یہاں موجود ہیں۔مثلاً خط نمبر ۳۳،محررہ ۲۸ اپریل ۱۸۹۰ء میں اپنے فرزند کو اردو شاعری کی 'قباحتوں' سے خبردار کرتے ہوئے اس سے دور رہنے کی نصیحت کی گئی ہے۔اردو شاعری پر مبالغے اور حقیقت سے دور ہونے کا الزام اس عہد میں عام طور پر عائد کیا گیا،جس کا آغاز انجمنِ پنجاب نے کیا۔حالی کو بھی اردو شاعری کے مبالغے کا اسیر اور 'ان نیچرل' ہونے کا خیال انجمنِ پنجاب کے جلسوں اور مناظموں میں شرکت کے نتیجے میں ہوا تھا۔مولانا ابوالحسن لکھتے ہیں:''وہ کیا فائدہ ہے جو تم نے شاعری میں تصور کیا ہے!ایک نقصان صریح یہ ہے کہ صدق میں شک ہوتا ہے،علی الخصوص جو طرز شاعری ہے کہ مشرقی ملکوں میں ہے،نہایت درجہ مضر ہے۔کس قدر مبالغے غلو کے ساتھ اس میں ہوتے ہیں کہ کسی قیاس میں نہیں آتے...خدا تعالیٰ نے انسان کو زبان اس مقصد کے لیے دی کہ جو بات اس کے دل میں ہو اس کے اظہار کے قابل ہو،وہ کہے،نہ اس لیے کہ جھوٹ اور ہزلیات کہے جو خلاف حکمت ...ہے۔آئندہ اس شغل سے پرہیز کرو اور دیگر علوم یقینی مثلاً طبعیات اور ہندسہ اور حساب وغیرہ میں کمال حاصل کرو تا کہ تمھاری عمر بھر کار آمد ہو...تم کو خود معلوم ہے کہ شعر کی مذمت کلام اللہ میں بھی آئی۔پس عقلاً اور نقلاً ہر طرح سے

ممنوع ہے اور ایسی ممنوع شے کا ارتکاب کسی طرح جائز نہیں ۔'' ایک اور مکتوب میں مشرقی شعرا کے ذمائم بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی شاعری کو مذہبی زاویے سے دیکھا گیا ہے۔''دیکھو مشرقی شعرا نے شعر گوئی میں اپنی حالت کس درجہ کو پہنچائی :

شیخ کعبہ سے چلے اور ہم چلے دیر سے        دیکھیے منزل پہ پہلے کون پہنچے خیر سے

اگر یہ کلامِ شاعر ہندو مذہب سے ہو تو کچھ تعجب نہیں، لیکن ایسا نہیں... شعرائے اسلام نے کیسے شاعری میں کفر کو اپنا مذہب ٹھہرا لیا ہے اور دین اسلام پر ترجیح دیتے ہیں.... بت و بت خانہ چھوڑ کر مومن چلا ہے کعبے کو ایک پارسا کے ساتھ۔ یہی روزمرہ شعرائے مشرقی کا ہے اور فتویٰ شرع ان کی نسبت لا یا جائے تو فتویٰ کفر اپنے ذمے لگائے تو عجب نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین سے حاصل کچھ نہیں۔'' یہ خیالات انیسویں صدی کی ان تعلیمی اصلاحی کوششوں کے غماز ہیں جن میں اس امتیاز کو قبول کرنے کی صلاحیت کا سخت فقدان تھا (اس امتیاز کو سمجھنے کی صلاحیت بلاشبہ تھی ) کہ شاعری میں لفظ کا کردار لغوی نہیں، استعاراتی و علامتی ہوتا ہے۔ جسے شاعری کا جھوٹ کہا گیا ہے ، وہ زندگی کی ایک بڑی سچائی کا تخیلی و علامتی بیان ہوسکتا ہے۔ نیز غزل کے کسی شعر کا متکلم، خود شاعر نہیں ہوتا، وہ کسی اور شخص یا طبقے کا نمائندہ ہوسکتا ہے اور اسی طرح کعبہ اور دیر سے مراد حقیقی خدا اور بھگوان کے اصلی گھر نہیں، علامت ہو سکتے ہیں ۔خدا سے مراد کوئی اور طبقہ یا فرد بھی ہوسکتا ہے جو خدا بننے کی کوششوں میں مصروف ہو۔ لہٰذا دیر سے سفر آغاز کرنے کا مطلب ،کعبے سے روگردانی نہیں، ایک ایسے راستے کا انتخاب ہے جو شیخ کے ظاہری راستے کے برعکس ہے ، جس طرح دیر، کعبے کے برعکس ہے ، مگر اخلاص کی وجہ سے منزلِ مقصود پر جلد پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ شاعرانہ زبان میں حقیقت و مجاز کا یہ کھیل اس چشمِ اصلاح سے اوجھل تو نہیں تھا جو نوخیزوں کی تعلیم پر نگران تھی ، مگر اس کی حقیقی معنویت سے وہ چشم پوشی کرتی تھی ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسی خط میں حقیقت و مجاز کے سوال پر شاعری اور تصوف دونوں کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ بحث کیا ہے، اپنے فرضی فرزند کو شعرا کی 'جہالت' اور 'گم راہی' کے ایک اور پہلو سے متعارف کروا کے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔'' واضح رہے کہ اہل تصوف کے بعض مصنفین جیسے ابو الحسن علی بن عثمان مصنف کشف المحجوب وغیرہ نے اصطلاحات اپنے طایفہ فقرا کے لکھے ہیں اور ان سے مراد اصطلاح خلاف لغت کے رکھے ہیں۔ روزمرہ الفاظ بھی بت و بت خانہ اور عارض خط، فصل و شراب اور مے خانہ وغیرہ ہیں۔ سو جو صاحب مشرب تصوف کے واقع ہیں ، اپنے اصطلاح کے بموجب جو چاہیں برتیں لیکن اس گروہ ظاہر کو کسی طرح جائز نہیں جو ان کے اصطلاحی معنی سے واقفیت نہیں رکھتے۔ بے وجہ اور بے تعلق اپنے کو کافر بت پرست اور رند بادہ کش ظاہر کرنا ....انھیں کا کام ہے۔ خدا تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے۔'' شعرا کو اہلِ تصوف کے مقابلے میں گروہِ ظاہر سے متعلق قرار دے کر ان سے حذر کرنے کی نصیحت کرنا، اس تہذیبی یافت سے فاصلہ اختیار کرنے پر اصرار کے مترادف تھا ، جسے کلاسیکی اردو شاعری نے تخلیق کیا تھا۔ علاوہ ازیں شعرا کو جاہل اور گم راہ خیال کرنا ، اس عہد کی حاوی آئیڈیالوجی کے تحت ہے جو کہیں تو ہندوستانیوں کو تہذیب سے عاری قرار دیتی ہے اور اس کے نمائندوں کو نشانۂ تنقید بناتی ہے اور کہیں ان کی تہذیب پر سو سو طرح کی تہمتیں رکھتی ہے تا کہ اپنی تہذیب سے ایک عام بے زاری پیدا کی جاسکے اور بعد ازاں ہندوستانیوں کو یورپی طرز پر مہذب بنانے کی تعلیمی سرگرمیوں کا جواز پیدا کیا جاسکے۔

**خزینہء دانش**

**مولوی محمد کریم بخش**

**تعداد صفحات :۱۲۴**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، بار چہارم مئی ۱۸۹۲ء**

مولوی محمد کریم بخش (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، کونچ ضلع جالون) نے یہ کتاب دراصل سرکاری نصابی کتاب کے طور پر تصنیف کی اور حکومت کو پیش کی مگر حکام کی جانب سے ابتدائی منظوری کے باوجود اسے ٹیکسٹ بک کے طور پر قبول اور شایع نہ کیا گیا۔اس امر کا احوال کتاب کے آخر میں منشی کریم بخش کی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن سے خط و کتابت کے عکس سے کھلتا ہے۔پہلا خط ۲۳ دسمبر ۱۸۷۴ء کو ڈائریکٹر کی طرف سے منشی صاحب کو لکھا گیا جس میں انھیں خوش خبری دی گئی کہ ان کے چھ اردو پمفلٹس مل گئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا پمفلٹ (رسالہ) اکٹھے چھاپے جائیں گے اور اسے تشریح الحروف کی جگہ رائج کیا جائے گا۔تیسرے اور چوتھے رسالے کو بھی ایک کتاب میں یک جا کرنے کا ذکر ہے اور پانچویں اور چھٹے رسالے کو ملا کر اسے سیکنڈ اردو ریڈر کا نام دیا جائے گا۔مگر منشی صاحب کی کوئی کتاب نہ تو حکومت نے نصابی کتاب کے طور پر منظور کی اور نہ شائع کی۔کوئی پانچ برس بعد یعنی ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو انھیں آر ٹی اے گرفتھ نے اطلاع دی کہ ان کی کتابیں شائع نہیں کی جاسکتیں۔ ہر چند وضاحت نہیں کی گئی مگر کتاب کے مطالعے سے لگتا ہے کہ مولوی صاحب کے چھ رسالوں کو یک جا کر کے نول کشور نے افادہ عام کی غرض سے شائع کر دیا۔

اس کتاب کی تصنیف سے مولوی کریم بخش کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ سکول کے طلبا اس کے ذریعے ہر علم کی کیفیت اور خوبیوں سے آگاہ ہوں اور ’’ان کے دلوں میں شوق پیدا ہو کہ علوم مفیدہ سے کس قدر فوائد ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے اکتساب سے کیسے کیسے عمدہ نتائج و فوائد جلوہ ءظہور میں آتے ہیں۔‘‘ کتاب دو فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔’’پہلی فصل میں اس امر کا بیان ہے کہ دنیا کیوں کر آباد ہوئی اور کس طرح مختلف پیشے رائج ہوئے، دنیا کے آدمی کس کس شکل میں اور کیوں مصروف ہیں۔دوسری فصل میں اس امر کا بیان ہے کہ دنیا میں کون کون علم مشہور ہیں اور ان میں کس کس بات کا ذکر ہے اور ان کے پڑھنے سے کیا فائدہ ہے اور علوم کی ترقی سے دنیا میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں۔‘‘ کتاب کا آغاز استاد و شاگرد کے درمیان سوال و جواب سے ہوتا ہے، مگر فقط تین سوال کیے گئے ہیں۔ پہلی فصل میں گاؤں، قصبہ اور شہر کے آباد ہونے کی تفصیل پیش کی گئی ہے؛ آگے آدمیوں کے پیشوں کا ذکر ہے اور زیادہ تر ہندوستانی پیشوں کا بیان ہے: جیسے کاشتکار، کنجڑے، باورچی، نان بائی، گھوسی (دودھ کے جانور پالنے والے)، اچار فروش، حلوائی، قلعی گر، ٹھٹھیرے (دھات کے برتن بنانے والے) بھڑ بھونجے، قصاب، لکڑی فروش، بقال، بنیا، وغیرہ۔ان تمام پیشوں کا تعلق کھانے پینے کی اشیا سے ہے۔آدمی کی ضرورت (جس نے یہ پیشے پیدا کیے) کپڑا اور مکان بھی ہے، اس لیے ان سے متعلق پیشوں کا ذکر بھی ہے۔مثلاً جولاہے، رنگ ریز دھوبی، بزاز، درزی وغیرہ۔مکان سے متعلق پیشوں میں تیلی، کاغذی، نمد گر، قالین باف، دری باف، سقا وغیرہ۔مصنف کا صریحی مقصود تو طلبا کو ہندوستانی سماجی ساخت سے آگاہ کرنا نظر آتا ہے، مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے جن پیشوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب معاشی اور معاشرتی اعتبار سے معمولی ہیں تو اس کا بالواسطہ منشا یہ تصور راسخ کرنا نظر آتا ہے کہ برصغیر کا سماج ’’معاشی اور معاشرتی اعتبار‘‘ سے معمولی ہے۔انیسویں صدی کے نصاب ساز اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ سماجی آگاہی، سماجی شناخت پیدا کرتی ہے۔مصنف نے اسی طرح نوکری، بیماری وصحت اور حکومت سے متعلق پیشوں (اداروں، عہدوں) کی تفصیل دی گئی ہے۔دوسری فصل میں علوم کے فوائد کا تفصیلی بیان ہے۔علم کو دینی اور دنیوی علم میں بانٹا گیا ہے۔علم دین

کی محض وضاحت ہے کہ اس سے مراد وہ علم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا کس نے بنائی اور اس کو بنانے والا کیسا تھا۔جب کہ علم دنیا سے مراد وہ علم لیا گیا ہے جس کے جاننے سے دنیا میں فائدہ ملتا ہے۔آگے علم دنیا کی قسموں کی ذیل میں علم زبان، علم جغرافیہ اور علم تاریخ کو شامل کیا گیا ہے، تاہم علم جغرافیہ پر چند صفحات لکھنے کے بعد علم تواریخ پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے ۔تاریخ قومی شناختیں پیدا کرتی ہے اور نو آبادیاتی دور کے نصابات کے ذریعے نئی قومی شناخت کی تشکیل مطلوب تھی۔علم تواریخ (یعنی سلطنتوں اور بادشاہوں کی تاریخ) کی ذیل میں لکھتے ہوئے مسلمانوں کی تاریخ کی بابت لکھا ہے کہ ''پھر مسلمانوں میں بھی آرام طلبی، عیاشی پھیلی، اتحاد جاتا رہا۔آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔علم اور اخلاق میں تنزل آ گیا ۔علوم مفیدہ تھے، ان کا رواج جاتا رہا۔عاشقانہ قصوں کی کتابیں نظم و نثر گھر گھر پھیل گئیں۔فریب و بدعہدی وقتل بھائیوں میں ہونے لگے۔آخر نتیجہ ان خرابیوں کا یہ ہوا کہ حکومت جاتی رہی۔''اور اسی مقام پر انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کا جواز درج کیا ہے:''تاجران برٹش جو اس ملک میں سوداگری کے واسطے آئے تھے، ہندوستان کی بد انتظامی دیکھ کر ملک گیری کا حوصلہ کیا .....سو برس سے کچھ زیادہ مدت ہوئی کہ انگلش گورنمنٹ حکمران ہے۔ ان کا مقابلہ پہلی عملداری کے فائدوں سے اسی علم تاریخ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی عملداریوں میں جہاں جھاڑی و جنگل کھڑے تھے اور شیر اور تیندوے پھرتے تھے اب وہاں کوسوں تک غلہ کے سرسبز کھیت نظر آتے ہیں۔''چناں چہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مصنف کا تصور تاریخ وہی ہے جو انگریز استعمار نے ہندوستان میں رائج کیا تھا۔یہ کہ تاجرانِ برٹش کی ملک گیری ہوسِ استحصال کی خاطر نہیں تھی ، بلکہ وہ تو مہربان آقا بن کر آئے ۔مسلمانوں کی عیاشی، گھر گھر میں عاشقانہ قصوں کی بھرمار اور عام بد انتظامی نے نئے انتظامِ سلطنت کی ضرورت پیدا کی تھی۔اس تصورِ تاریخ سے نئی نسل کے دل میں انگریز حکمرانوں کے انصاف پسند، علم پرور اور عوام دوست ہونے کا نقش قائم ہوتا تھا اور اس بغاوت کی آگ سرد ہوتی تھی جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کو یاد کرنے یا برصغیر کے معاشی استحصال پر دھیان دینے سے بھڑک سکتی تھی۔ زیرِ نظر کتاب میں آگے تواریخ مذہب، تواریخ علوم ، تاریخ اقوام پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ پھر علم حساب ، ریاضی، جبر و مقابلہ، ہندسہ، ہیئت، ادات (کلوں کا علم) آسیہ ہوا، حرارت و روشنی ، معادن، کیمیا، فلاحت، نباتات، حیوانات، مناظر، مناظرہ، منطق ،طب، اخلاق، انتظام مدن، سیاست مدن، قوانین فوجداری، دیوانی، قوانین مال کا بیان ملتا ہے ۔ایک ہی کتاب میں جامع نصاب پیش کر دیا گیا ہے۔

**کیمیائے حکمت حصہ اوّل**

**مولوی اوحد الدین احمد**

**تعداد صفحات :۵۶**

**مطبع نامی منشی نول کشور، کان پور، باراوّل، ۱۸۹۷ء**

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں دو طرح کی اردو کتابیں تصنیف و تالیف کی جا رہی تھیں: سرکاری طور پر مدارس کے لیے منظور شدہ اور سرکار کی منشا کے مطابق عوام و خواص کے لیے، جنھیں طلبا بھی امدادی یا اضافی کتابوں کے طور پر پڑھ لیا کرتے تھے۔ان دوسری قسم کی کتابوں کی تصنیف کی کہانی کم و بیش ایک جیسی ہے کہ محکمہ تعلیم کا کوئی افسر (زیادہ تر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن) کسی سرکاری سکول کا معائنہ کرتا تھا؛ اساتذہ سے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم کرتا تھا کہ آیا انھوں نے کوئی کتاب تصنیف کی ہے یا نہیں۔جن لوگوں نے کوئی کتاب تصنیف کی ہوتی ، ان سے صاحب بہادر خوش ہوتے اور انعام و اکرام سے بھی نوازتے؛ خوش نودی کا اظہار کرتے جو کسی انعام سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس سے اساتذہ میں کتابوں کی تصنیف کا ایک عمومی میلان پیدا ہوا۔ یہ کتابیں

قواعدزبان ،اخلاقی قصے کہانیوں پر زیادہ تر مشتمل ہیں۔ کیمیائے حکمت کا شمار انہی آخرلذکرقسم کی کتابوں میں ہوتا ہے۔مولوی اوحدالدین (مدرس فارسی مدرسہء بلرام پور )نے اس کتاب کی شان تصنیف کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ اس عہد کی تعلیمی ترجیحات،مصنف استاد اورحکام تعلیم کے روابط کی نوعیت ،اساتذہ مصنفین کے اسلوب گفتار کوعمدگی سے واضح کرتا ہے۔مصنف نے حمد و نعت (جو منظوم و منثور ہے)کے بعد ڈائریکٹر تعلیمات عامہ ملک اودھ کی مدح لکھی ہے۔ڈائریکٹر ( کالن اے آر برونگ )مدرسہ بلرام پور آئے ،طلبہ کا امتحان لیا۔اساتذہ سے خوش ہوئے۔مولوی اوحدالدین نے اگلی صبح سیر کے دوران میں ڈائریکٹر کی خدمت میں قصیدہ ء بہاریہ نذر کیا۔صاحب نے ''از ذرہ نوازی قبول فرما کرعز و اعتبار دیااور باالتفات تمام استفسار کیا کہ تو نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی ہے۔خاکسار نے دست بستہ عرض کیا کہ حسب الحکم جناب مستطاب مہر سپہرصدارت ماہ آسمان جلالت ہزہائی نس دی آنر ایبل سرمہاراجہ دگیج صاحب بہادر کے سی آئی اقبالہ چند کتابیں تصنیف و تالیف کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔من بعد ارشاد ہوا کہ اگرممکن ہوتو ملاحظہ ایں جانب کے واسطے بھی ایک کتاب متضمن فضیلت علم و ادب و راستی وکم گوئی وتہذیب اخلاق و دیگر فوائد حکمتیہ بطرز اختیار کہ مفید عام و بکار آمد انام ہو،زبان اردو میں بعبارت واضحہ مرقوم کر اور باسم کیمیاے حکمت اوس کوموسوم کرتا عوام کالانعام کہ مفہوم انسانیت پر وقوف نہیں رکھتے ہیں اور بجز اکل وشرب علت غائی عالم کون و مکان نہیں سمجھتے ہیں،مستفید ہو کر مبداء اور معاد کو پہچانیں اور ضلالت و بطالت میں اوقات عزیز نہ گزرانیں۔'' یہ گفت گو نہ صرف نو آبادیاتی عہد کے معلم اخلاق کی اس مدحت پرستانہ نفسیات پر روشنی ڈالتی ہے جو حکامِ تعلیم کے حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنے سے وجود میں آئی تھی ، بلکہ حکامِ تعلیم کی ہندوستانی عوام کالانعام کے بارے میں تضحیک آمیزآرا کا علم بھی دیتی ہے۔

کتاب بنیادی طور پرحکمت ونصیحت کے مضامین پر مشتمل ہے ۔ان مضامین کوحکمت،نصیحت، حکایت ،قول ،نقل ،نکتہ اور فائدہ کے عنوانات دیے گئے ہیں اورکل ۵۹ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔جگہ جگہ ،مگر حسب موقع اشعار بھی درج ہیں اور کہیں مزید وضاحت کی غرض سے حاشیے بھی دیے گئے ہیں۔کتاب طبع زادضرور ہے،مگر اس کی حکایات و اقوال اس لطف وحسن سے خالی ہیں جو حکایات سعدی میں ملتا ہے اور جوحکمت ونصیحت پرمبنی بیش تر کتابوں کا محرک اور پروٹو ٹائپ ہے۔حکایات پر راست ناصحانہ انداز اس درجہ حاوی ہے کہ وہ بیانیے کے تجسس اور حیرت سے یک سر محروم ہوگئی ہیں۔بیانیے کے ان عناصر کے فقدان ہی سے اس کتاب ِحکمت کی حکایات میں کیمیائی اثر پیدانہیں ہوتاجس کا التباس کتاب کے نام سے پیدا کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی حکایات پر اس عہد کی حاوی آئیڈیالوجی کس کس طور اثر انداز ہوئی ہے ،یہ جاننے کے لیے پہلی حکایت کا حوالہ ہی کافی ہے۔ یہ حکایت علم کی فضیلت کے اس نئے مفہوم کو پیش کرتی ہے جونو آبادیاتی عہد میں وضع ہواتھا۔ایک بوڑھی عورت نے ایک امیر کے پاس اپنا پانچ سالہ بیٹاپڑھنے کو بٹھایا۔ (بوڑھی عورت کا بیٹا پانچ سال کا کیسے ہوسکتا ہے، اس کا پوتا ،نواسہ ہوسکتا تھا۔حقیقت نگاری پرمبنی فکشن کی شعریات کی رو سے یہ اہم سوال ہے مگران حکایات میں اس طرح کے سوالات اہمیت نہیں رکھتے کہ مقصود حکایت نہیں،حکایت کے ذریعے پیغام یعنی نصیحت کی ترسیل ہے ) ۔امیر کے لڑکے نہیں پڑھے،گم راہ ہوئے،مگر بڑھیا کا بیٹا پڑھ گیا۔''نو برس کی مدت میں وہ لڑکا پڑھ لکھ کر فاضل ہوا...حکام عہد کو پسند آیا۔عہدہ جلیلہ مرحمت فرمایا،جو کام تفویض ہوا ،بخوبی انجام دیا۔اوقات خوش گزرانی ۔تمام عمر نیک نام جیا۔''یعنی علم کی فضیلت کا تعین حکام کے تفویض کردہ عہدہ جلیلہ سے ہوتا ہے،عالم کون و مکان کی علت غائی جاننے سے نہیں۔اسلوب اور مافیہ کے اعتبار سے یہ خاصی غیر دل چسپ حکایت ،مصنف کے اس دعوے کے برعکس ہے جسے ایک خاص علمی شان کے ساتھ کتاب کے سببِ تالیف کی ذیل میں پیش کیا گیا ہے ۔اس سے ہمیں اس فاصلے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو نوآبادیاتی آئیڈیالوجی اور ہندوستان کی سماجی حقیقت میں موجود تھا۔علم کو عالمِ کون ومکاں کی علتِ غائی

جاننے کا ذریعہ قرار دینا، آئیڈیالوجی تھی جب کہ عملی سماجی حقیقت یہ تھی کہ علم کا مقصود انگریز سرکار میں عہدہ ء جلیلہ پانا تھا۔ آئیڈیالوجی اور سماجی حقیقت میں موجود فاصلے کا ادراک دونوں میں مضمر تضادات کا انکشاف کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اشیا کے معانی میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ کون ومکاں کا ارفع تصور سماجی کون ومکاں میں بدل جاتا ہے اور اس کی 'تسخیر' علم کی علتِ غائی بن جاتی ہے۔ علم کی فضیلت کے اسی نئے تصور کو اکبر نے طنز کا نشانہ بنایا۔ کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے / بی اے کیا، نوکر ہوئے اور مر گئے۔

کتاب کے قطعہ تاریخ (از مولف) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔

**عیار القواعد**

**مولوی ممتاز الحق**

**تعداد صفحات :۵۱**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، بار ہفتم جنوری ۱۹۰۱ء**

اردو میں فارسی قواعد کی کتاب ہے۔ مولوی ممتاز الحق نے، جو خود فارسی مدرس تھے، یہ کتاب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی وشمالی اودھ کے حکم پر مدارس اودھ کے طلبا کے استفادے کی غرض سے تالیف کی۔ مئولف نے خود وضاحت کی ہے کہ ''مخفی نہ رہے کہ یہ سوالات و جوابات ضروری قواعد فارسی صرف ونحو فارسی کے جو واسطے مبتدی طالب علم کے بہت مفید اور کار آمد ہیں اور اس کے یاد کرنے کے سبب امتیاز پر درمیان اسم اور فعل اور حروف سے اور مصدر سے صیغوں کے اشتقاق و نیز ترکیب کلمات پر با آسانی تمام قادر ہوسکتا ہے، زبان اردو میں اس خاک پائے طالبان حق اضعف الخلائق محمد ممتاز الحق نے جمع کیے... اس رسالہ کو دو جزو پر تقسیم کیا۔ چوں کہ یہ رسالہ سوالات اور جوابات پر شامل ہے، لہٰذا اس کا نام عیار القواعد رکھا۔'' جزو اوّل میں صرف اور جزو ثانی میں علم نحو پر بحث کی گئی ہے۔

**فن زراعت کی پہلی کتاب**

**جے بی فلر**

**تعداد صفحات :۱۰۴**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، طبع ہفتم، اپریل ۱۹۰۴ء**

کتاب کے سرورق پر درج ہے کہ '' جے بی فلر متعلق محکمہ زراعت وتجارت نے دیہاتی وتحصیلی مدرسوں کے طلبا کے واسطے کان پور میں تصنیف کیا، حسب الحکم جناب نواب لفٹنٹ گورنر و چیف کمشنر بہادر ممالک مغربی وشمالی اودھ اور جو کہ اب حسب الحکم ٹکسٹ بک کمیٹی ضلع اور دیہاتی اسکولوں میں دفعہ ۴۱۳ میں داخل کی گئی ہے۔'' یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس کتاب کی تیاری میں جے بی فلر نے کسی ہندوستانی سے مدد لی یا نہیں۔ کتاب سولہ اسباق یا ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں نباتی حیات سے متعلق اس زمانے کی جدید معلومات پیش کی گئی ہیں؛ کاشت کاری کے جدید طریقے وضع کیے گئے ہیں اور جدید کاشت کاری کے اوزاروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے جدید سے مراد یورپی ہے۔ کتاب کے نام سے شائبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اردو میں فن زراعت کی پہلی

کتاب ہے، جب کہ اصل یہ ہے کہ یہ دیہاتی طلبا کے لیے (جو شاید چھٹے درجے میں ہوتے تھے) ابتدائی کتاب ہے۔

ایک اہم بات دیباچے میں یہ درج ہے کہ ''کاشت کاری کے عمدہ طریقے جاننے اور ان کے عمدہ ہونے کے سبب جاننے میں فرق ہے۔پہلی بات یعنی کاشت کاری کے عمدہ طریقے ہندوستان میں عموماً تجربہ سے جانے جاتے ہیں۔اپنی روزمرہ کارروائیوں کی وجوہات شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔وہ اتنا ہی جاننا کافی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اور ان کے بزرگوں نے ان طریقوں سے کام یابی حاصل کی ہے،لیکن عمدہ کاشت کاری کے لیے وجوہات کا جاننا کچھ کم ضرور نہیں ہے...پس وجوہات کا جانناواسطے زیادہ ترقی کے ضرور ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں زراعت پشت ہا پشت سے ایک ہی طور پر بغیر ترقی کے چلی آتی ہے۔'' چناں چہ کتاب میں زراعت کے نئے طریقے اوراوزار متعارف کرواتے ہوئے ،ان کی افادیت اور افادیت کی وجوہ بھی پیش کر دی گئی ہیں،اس طور اس کتاب کے ذریعے ہندوستان میں زراعت کو جدید سائنسی اصولوں پر استوار کرنے کی کوشش ہوئی۔....مذکورہ بالا وضاحت کے ذریعے ہندوستان اور یورپ کے طرزِ فکر میں فرق بھی اجاگر ہو گیا ہے کہ ہندوستانی روایت سے استناد کرتے ہیں اور یورپی استقرائی طرزِ فکر کی بنیاد پر درست و نادرست کا فیصلہ کرتے ہیں۔انیسویں صدی کے ہندوستان میں یہ سائنسی طرزِ فکر یورپی اثرات کے تحت ہی آیا۔

**مبادی الحساب حصہ اوّل**

**پنڈت موہن لعل**

**تعداد صفحات :۸۳**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، بار سوم، ۱۹۰۸ء**

یہ کتاب بھی مما لک مغربی ومشرقی کے مدارس کے لیے ،ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے حکم پر تصنیف کی گئی۔مصنف نے ابتدائی درجوں کے طلبا کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے آسان زبان میں اعداد،جمع،تفریق،تقسیم،پہاڑے لکھ دیے ہیں۔

**زبدۃ القواعد: حصہ دوم**

**رائے درگا پرشاد**

**تعداد صفحات :۸۹**

**مطبوعہ نول کشور، کان پور، بار ہفتم، مارچ ۱۹۱۲ء**

قواعد زبانِ اردو کی یہ کتاب رائے درگا پرشاد(اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس صوبہ اودھ) نے مسٹر جان سی نسفیلڈ،ایم آئی انسپکٹر مدارس صوبہ اودھ کے حکم پر صوبہ اودھ کے مدارس کے لیے بہ طرزِ جدید یعنی بہ تتبع زبانِ انگریزی آسان الفاظ میں تالیف کی گئی۔دیباچے میں سببِ تالیف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''جو طلبہ زبانِ انگریزی و اردو دونوں سیکھتے ہیں ، ان کو ہر دو زبان کے قواعد سیکھنے میں خلجانِ اختلافِ قواعد نہ ہو اور دونوں زبانوں کی عبارت کی ترکیب با آسانی قواعدِ مشترک سے سیکھ سکیں اور طلبہ اردو خواں بہ طریقہ آسان ترکیب اردو کر سکیں''۔کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں قواعد زبان اردو کی تعریف کی گئی ہے اور ان میں ہجا،املا ،صرف ،نحو اور عروض کو شامل کیا گیا ہے۔دوسرے باب میں صرف کو موضوع بنایا گیا ہے۔نہ تو نحو،املا اور عروض پر لکھا گیا ہے اور نہ عروض کو قواعدِ زبان میں شامل کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے۔مئولف نے قواعد زبان کی تعریف کی ذیل میں لکھا ہے کہ ''اصطلاح میں قواعدِ زبان وہ علم ہے جس سے صحیح بولنا اور لکھنا معلوم ہو۔''شاید مئولف صحیح بولنے سے صرف نثر میں نہیں ، بلکہ شعر

میں اظہار بھی مراد لیتے ہیں۔زیادہ تر جن قواعد پر لکھا گیا ہے ،وہ عربی فارسی کے معروف قواعد ہیں۔ جیسے لفظِ موضوع (کلمہ) ، مہمل،اسم،فعل،حرف،حروفِ علت،مخرج کے اعتبار سے حروف کی قسمیں (حلقی،شفویہ،سنّیہ،اسلیہ وغیرہ)۔تاہم آخرالذکر حروف کی قسمیں جدید یورپی صوتیات سے مصنف کی آ گاہی کا ثبوت دیتی ہیں اور کہ سکتے ہیں کہ اصوات کی یہ درجہ بندی انگریزی اور اردو میں مشترک ہے۔یہ الگ بات ہے کہ مخرج کے اعتبار سے حروف (صحیح) کی آٹھ قسمیں ہیں: کنٹھی، حلقی،جنکی (تالو سے نکلنے والی آوازیں)،تحی (دانتوں کی جڑوں اور زبان کی نوک سے)،دندانی،شفوی (ہونٹوں سے)،انفی (ناک سے) اور صفیری (زبان کی نوک سے)۔جب کہ مؤلفِ کتاب نے با اعتبارِ مخرج حروف کی پانچ قسموں کا ذکر کیا ہے۔یہی نہیں راے درگا پرشاد نے حروفِ علت یعنی Vowel کا ذکر تو کیا ہے،مگر ان کی آوازوں کو حروفِ صحیح یعنی Consonant کے تحت رکھا ہے۔نیز بعض اصوات کے مخارج کی نشان دہی میں بھی مؤلف سے سہو ہوا ہے۔مثلاًک کی صوت حلقی ہے،مؤلف نے اسے شفویہ یعنی تالو سے ادا ہونے والی صوت کہا ہے[درگا پرشاد نے شفویہ سے تالو سے ادا ہونے والی آوازیں مراد لی ہیں،حالاں کہ یہ اصلاح دولبی یا ہونٹوں سے ادا ہونے والی اصوات کے لیے مخصوص ہے] ؛م کی صوت با اعتبارِ مخرج انفی ہے جب کہ مؤلفِ زبدۃالقواعد نے اسے سنّیہ یعنی دانت کی جڑ سے نکلنے والی صوت قرار دیا ہے۔بہر کیف اس طرح کے سہو ابتدائی نصابی کتابوں میں عام ہیں۔

**امان اللغات**

***مولوی محمد امان الحق***

***تعداد صفحات :۴۰***

***مطبع نامی نول کشور،کان پور، بار چہارم،دسمبر۱۹۱۳ء***

مولوی محمد ممتاز الحق (مدرس دوم گورنمنٹ ماڈل سکول لکھنو) نے یہ مختصر عربی اردو لغت ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ،اودھ کے حکم پر"طلبا مدارس و مکاتبِ انگلو ورنیکلر سر رشتۂ تعلیم" کے استفادے کے لیے تالیف کیا۔مولوی صاحب نے پنڈت شیونرائن ، ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنو کو بھی تالیف کتاب کا محرک لکھا ہے۔لغت کے ابتدائیے میں زبان اور علوم کے تعلق پر ایک اہم نکتہ ملتا ہے کہ "تحصیلِ علوم و تکمیل فنون بدون زبان دانی محال ہے اور زبان دانی و تحقیق الفاظ و معانی بلا واقفیت سخت بعید از وہم و خیال ہے۔" آگے اردو کو مرکب زبان قرار دے کر ان زبانوں کے لغت کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اردو کا حصہ ہیں۔" ظاہر ہے کہ الفاظ عربیہ کا استعمال اردو میں زیادہ ہے اور کوئی کتاب عام فہم ایسی نہیں جس سے طلبا اور مدارس سرکاری اور دیگر اشخاص اردو خوان الفاظ مستعملہ اردو کے معانی موافق محاورہ اردو کے جانیں اور تھوڑی مشقت و محنت میں عربی کے مصادر اور مشتقات اور واحد اور جمع اور مجرد اور فرید اور علم اور جنس وغیرہ کو پہچانیں۔" یعنی لغت میں عربی الفاظ کے مطالب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قواعدی شناخت بھی واضح کی گئی ہے۔یہی نہیں ہر لفظ کے اشتقاقات بھی مع ان کی قواعدی شناختوں کے دیے گئے ہیں۔مثلاً

**ثقل**: بھاری ہونا ؛حا ثقالت،ثقل ؛ جم اثقال؛صنعت ثقیل؛آ مثقال[ایک وزن جو چار یا ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے]؛جم **مثاقیل**

سبق: آگے جانا،گذرنا؛فا سابق؛مو سابقہ؛مفیہ مسبوق؛مص سبق پڑھنا؛حاسبق؛مص سبقت،پیشی قبول؛حا سبقت ہر صفحے پر مختصر حاشیے بھی دیے گئے ہیں،جن میں بعض معانی کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔

یہ کتاب مارچ ۱۸۷۰ء میں تصنیف ہوئی تھی۔

**مکتب نامہء اردو**

**مصنف کا نام درج نہیں**

**تعداد صفحات :۱۲۴**

**مطبوعہ نول کشور، لکھنو، بار دوازدہم ، جولائی ۱۹۲۱ء**

اپنے زمانے کی یہ ایک معروف ومقبول کتاب تھی، اس لیے اس کی اشاعت مسلسل ہوتی رہتی تھی۔کتاب میں محرک تالیف کا ذکر ہے نہ اس کے مئولف کا۔کوئی خاص شخص یا سرکاری عہدے دار اس کا محرک محسوس نہیں ہوتا، ورنہ اس کا اور مئولف کا ذکر ضرور موجود ہوتا۔کتاب کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محرک زمانہ تھا۔نو آبادیاتی عہد میں ،جب اردو کی تعلیم دی جانے لگی تو اکثر کتابیں تو سرکاری حکم پر تصنیف کی گئیں، مگر کچھ کتابیں زمانے کا مزاج اور پسند نا پسند دیکھتے ہوئے لوگوں نے اپنے طور پر تالیف کیں۔ یہ کتابیں بہ یک وقت طلبائے سکول اور استفادہء عام کے لیے ہوتی تھیں۔یہ بھی اسی طرز کی کتابوں میں شمار کی جانی چاہیے۔۔۔کار پردازان مطبع کی جانب سے خاتمۃ الطبع (جو نول کشور کی شایع کردہ ہر کتاب کے آخر میں موجود ہے اور کتاب سے متعلق بنیادی اور مفید معلومات فراہم کرتا ہے) میں درج ہے کہ'' شکر خدا کا کہ کتاب ِ مفید مسمیٰ بہ مکتب اردو معروف بہ معلم الحساب جس میں حکایات انداز آمیز اور خطوط اور رقعات نویسی کے دستور اور ہر قسم کے القاب وآداب و جملہ طریقے مدات سیاق اور کل حساب کے لکھے ہیں۔''کتاب چار ابواب میں تقسیم ہے۔پہلے باب میں چھیالیس نصیحتیں درج ہیں،جیسے جلدی اٹھنا، استاد کا ادب کرنا ،کھانے کا آداب، لباس کے آداب،صفائی کے آداب وغیرہ۔دوسرے باب میں نصیحت آموز کہانیاں ہیں جن میں کہانی پر نصیحت حاوی ہے۔تیسرے باب میں چودہ خطوط اور چار رقعے ہیں۔چوتھا باب حساب سے متعلق ہے۔اسی باب میں مختلف قسم کی تحریریں لکھنے کی ہدایات اور ان کے نمونے درج ہیں،جیسے تمسک ،حاضر ضامنی ،عرضی،حکم نامہ، اقرار نامہ، وکالت نامہ، مختار نامہ،قبض الوصول وغیرہ۔مختلف عدالتی دستاویزات کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں۔حساب کے سوالات اور ایک سو بارہ برس کی جنتری بھی دی گئی ہے۔

**آداب المضامین: حصہ اوّل**

**مولوی نثار احمد**

**تعداد صفحات :۲۲۸**

**مطبع انوار احمدی،الہٰ آباد، بار اوّل[ کتاب پر سن تالیف درج نہیں،تاہم دیباچے کے آخر میں ۱۵جون ۱۹۲۸ء کی تاریخ لکھی ہے۔]**

مولوی نثار احمد (بی۔اے۔ایل۔ٹی، اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج،الہٰ آباد) کی مئولفہ یہ کتاب ان اضافی نصابی کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو سر رشتہء تعلیم کی طرف سے نصاب کے لیے منظور نہیں ہوتی تھیں،مگر جنھیں طالب علم اپنے علم میں اضافے کے لیے پڑھ لیا کرتے تھے۔انھیں کتب غیر درسیہ کہا جاتا تھا۔اسے مئولف نے ''مضمون نویسی پر اپنے رنگ کی نئی اور

اچھوتی کتاب'' قرار دیا ہے۔یہ کتاب انٹر کے طلبا کے لیے لکھی گئی۔دیباچے میں کتاب کی وجہ ء تالیف کی صراحت کر دی گئی ہے۔مئولف نے اوّل یہ شکایت کی ہے کہ نوجوان انگریزی میں اظہارِ خیالات کر لیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں،مگر اردو ہندی میں نہیں۔یہ امر مئولف کے نزدیک باعثِ شرم ہے۔مئولف کے نزدیک اس کے ذمہ دار انگریز حکام اور طلبا دونوں ہیں۔حکام ہندوستانی علم و ادب کی طرف بے توجہی برتتے ہیں اور طلبا لاپروائی۔مئولف انگریزی کے اجارے اور مقامی زبانوں کے پچھڑ جانے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:'' جب سے انگریزی تعلیم کا رواج ہوا ہے،جانبین کی توجہ حصولِ زبانِ انگریزی کی طرف رہی۔ایک طرف یہ خیال تھا کہ انگریزی ہی سب کچھ ہے ؛سرکار میں،دربار میں،کاروبار میں،ہر جگہ انگریزی ہی کی ضرورت ہے۔دوسری جانب یہ دھوکا کہ اردو ہندی ہمارے گھر کی لونڈیاں ہیں،لہٰذا ان کے حصول میں کوشش کرنی اور وقت صرف کرنا غیر ضروری ہے۔امتحانات میں کام یابی حاصل کرنے کے لیے کورس کا پڑھ لینا کافی ہے۔قواعد کا مطالعہ،مضمون نویسی کی مشق ،تشریحات ،حل مطالب وغیرہ غیر ضروری۔'' مگر اب صورتِ حال بدل رہی ہے''اب خیالات بدل رہے ہیں اور اردو کی اہمیت محسوس کی جارہی ہے ۔خصوصاً والیِ دکن نے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھ کر اردو میں نئی روح پھونک دی۔'' حقیقت یہ ہے کہ مئولف کے یہ خیالات اس زمانے کی لسانی صورتِ حال کی وضاحت سے زیادہ اس کتاب کی وجہء تالیف کی صراحت کرتے ہیں۔

کتاب میں حکایت نویسی،تلخیص نویسی (نظم کی نثر)،خطوط نویسی اور مضمون نویسی کے آداب یعنی طریقوں اور رسمیات کی وضاحت کی گئی ہے اور ان سب کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔اس ضمن میں انگریزی زبان کی تدریس کو بہ طورِ نمونہ سامنے رکھا گیا ہے۔

**اردو زبان کی پانچویں کتاب**

**[ٹکسٹ بک مجوزہ ڈائریکٹران سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ وصوبہ جات بہار واڑیسہ]**

**خاں صاحب مولوی محمد اسماعیل**

**تعداد صفحات :۲۰۸**

**نول کشور پریس لکھنو،دفعہ ۶۰،نومبر ۱۹۳۳ء**

یہ کتاب دراصل دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں نظم ونثر کے چونسٹھ نمونے ہیں،اور دوسرے حصے میں فقط زراعت پر گیارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔خدا رازق ہے(نظم) | ۲۔وقت سرمایہ ہے | ۳۔قوس قزح اور ہالہ | ۴۔امید (نظم) |
| ۵۔حکیم ایسپ کا بیان | ۶۔علم کی ضرورت (نظم) | ۷۔کلکتہ | ۸۔حیا (نظم) |
| ۹۔صرفِ دولت | ۱۰۔بخیلی اور فضولی (نظم) | ۱۱۔ہمت | ۱۲۔سچائی |
| ۱۳۔ایک گدھا شیر بنا تھا (نظم) | ۱۴۔حکایت (نظم) | ۱۵۔ثمرہ اعمال | ۱۶۔حکایات (نظم) |
| ۱۷۔ایک قانع مفلس (نظم) | ۱۸۔غلامی کا انسداد | د۱۹۔علم زندگی (نظم) | ۲۰۔راستی نجات ہے(نظم) |

۲۱۔سفر ۲۲۔جاڑا اور گرمی (نظم) ۲۳۔ارسطو ۲۴۔شیر (نظم)
۲۵۔تیمور ۲۶۔اپنی ترقی کرو (نظم) ۲۷۔مرغ اسیر (نظم) ۲۸۔جرأت
۲۹۔عبرت (نظم) ۳۰۔حرص (نظم) ۳۱۔امر اتفاقی ۳۲۔تحقیق
۳۳۔بکری کا بھوت ۳۴۔باجے کا بھوت ۳۵۔یاروں کا گلہ (نظم) ۳۶۔دوستی کی ضرورت
۳۷۔دوست کا انتخاب ۳۸۔دوستانہ سلوک ۳۹۔تعریف روضہ تاج گنج (نظم) ۴۰۔مخلوقات
۴۱۔داستان (نظم) ۴۲۔بادمراد (نظم) ۴۳۔راست گوئی (نظم) ۴۴۔حواس خمسہ
۴۵۔قوت شامہ ۴۶۔قوت باصرہ ۴۷۔قوت سامعہ ۴۸۔قوت ذائقہ
۴۹۔قوت لامسہ ۵۰۔اونٹ (نظم) ۵۱۔عقل ۵۲۔حقوق والدین
۵۳۔جامع دہلی ۵۴۔خواب راحت ۵۵۔حکومت ۵۶۔ایک طلسم
۵۷۔ستارے اور کہکشاں (نظم) ۵۸۔اشعار آتش ۵۹۔اشعار انشا ۶۰۔ہوا اور آسمان
۶۱۔مبادلہ ۶۲۔نوشیروان عادل ۶۳۔مہا بھارت ۶۴۔روضہ تاج محل

**زراعت**

۱۔زراعت اور اقسام زراعت ۲۔زراعت کا کام اور ان کے فائدے ۳۔زمین اور اس کی اصلیت ۴۔زمین اور اس کی قسمیں
۵۔ہل اور اس کی قسمیں ۶۔جوتائی اور میائی ۷۔زراعت کے مویشی ۸۔ہل کے بیل اور اس کی نسلیں
۹۔کھاد اور اس کی قسمیں ۱۰۔بیج اور اس کی بوائی ۱۱۔زراعت اور اس کی ضرورتیں

کتاب کے دیباچے میں مؤلف نے کتاب کے مقصد اور اس کے مندرجات سے متعلق چند اہم باتیں لکھ دی ہیں۔اوّلاً یہ واضح کیا ہے کہ اردو زبان کی یہ پانچویں کتاب اسی سلسلے کی کڑی ہے جس کا آغاز قاعدے سے ہوتا ہے۔لہٰذا ''ہر کتاب مابعد میں بہ نسبت ماقبل کے الفاظ وعبارات اور طرزِ بیان کو بتدریج ترقی دی گئی ہے تاکہ ایک کے اختتام پر پر دوسرے کے آغاز کی صلاحیت پیدا ہوجائے ، یہاں تک کہ سب سے اخیر کتاب کا درس مڈل لورس کا مرحلہ طے کرنے کے لیے قابل ومستعد بنا دے۔''بنیادی طور پر یہ کتاب اس زمانے کے عمومی تعلیمی مقصد یعنی بچوں کی ''عقلی ا خلاقی تربیت'' اوران کی '' واقفیت عامہ کی توسیع'' کے حصول کا ذریعہ ہے ،جس کا ذکر دیباچے میں موجود ہے ۔تاہم عمومی تعلیمی مقصد، ایک حتمی مقصود ہونے کے باوجود ایک دوسرے مقصد کے پس پردہ رکھا گیا ہے اور یہ مقصد ایک ڈھیلی ڈھالی ساخت رکھتا اور اس میں کئی دوسرے مقاصد وفوائد کو سمو لینے کی گنجائش ہے۔مؤلف واضح کرتے ہیں کہ'' ہر چند مذاقِ زبان دانی کا نشوونما ان کتابوں کا موضوع ومقصود اصل ہے،مگر اس ضمن میں بالخصوص دو اور ضروری فوائد بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔'' یہ فوائد تفننِ طبع اور علوم وفنون کی معلومات ہیں۔کتاب کے مندرجات ان فوائد کو پیش نظر رکھ کر تالیف وترتیب دیے گئے ہیں۔تفنن طبع اور تفریحِ خاطر کے لیے ''مضامین ومطالب کی رنگا رنگی اور مختلف اوزان کی اقسامِ

نظم''، کا انتخاب کیا گیا ہے۔گویا تفنن وتفریح سے مراد مزاح نہیں لیا گیا، بلکہ فقط تکرار سے بچنے کی حکمت عملی کو تفریح خاطر قرار دیا گیا ہے۔دوسرے فائدے کے ضمن میں مئولف نے واضح کیا ہے کہ'' ان کتابوں کی تالیف وتلفیف کا ماخذ و منشا ..مختلف علوم وفنون ہیں،مثلاًامثال وقصص ، اخبار وسیر، آداب و اخلاق ،تواریخ طبعی،تشریح الابدان ،فزیالوجی،حفظان صحت، اصول فلاحت،علم انتظام وغیرہ۔''اس طور اس کتاب میں فطری،سماجی سائنسی علوم اور انسانیات سے متعلق موضوعات کو شامل کر دیا گیا ہے۔لہٰذا یہ محض اردو کی کتاب نہیں ہے بلکہ اردو کے ذریعے دوسرے علوم کی تدریس کا بیڑہ بھی اٹھاتی ہے۔زراعت پر الگ حصہ موجود ہے جو دیہی طلبہ کے لیے بالخصوص شامل کیا گیا ہے۔

حصہ نثر میں صرف تین کہانیاں( ہمت، بکری کا بھوت،باجے کا بھوت) اور باقی مضامین ہیں۔یہ متنوع موضوعات پر ہیں۔سائنسی معلوماتی (۱۶)عقلی حکیمانہ(۷) ،سوانحی(۵)، اخلاقی (۴) اور تاریخی(۱) موضوعات پرمضامین شامل ہیں ۔سوانحی اور تاریخی مضامین میں ''نو آبادیاتی ڈھنگ'' سے عقلی و اخلاقی تربیت کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے۔مثلاً 'جرأت'میں سر جان لارنس ( گورنر جنرل )کے ایام طفولیت کاایک قصہ بیان ہوا ہے کہ اس نے کس طور جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنی دایہ کوایک مصیبت سے بچایا تھا۔ایک دن دایہ پانچ سالہ لارنس کو ہمراہ لیے خریداری کے لیے گئی۔اس کے پاس پانچ پونڈ کا نوٹ تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ ایک نوکرانی کے پاس اتنی بڑی رقم ، دکان داروں کو شبہے میں ڈالنے کے لیے کافی تھی۔اسے مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا گیا۔اس سے پہلے کہ اس پر چوری کا الزام لگا کر اسے جیل بھجوایا جاتا، ننھے لارنس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا کہ'' یہ نوٹ اس کو ابا جان نے دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگرتم اس کو چھوڑ دو گے تو بہت واجبی بات کرو گے،کیوں کہ میرے ابا خوب واقف ہیں کہ میں جو کچھ کہتا ہوں سب سچ کہتا ہوں۔''چناں چہ دایہ کو بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا گیا اور لارنس یہ سوچتے ہوئے گھر کو چلا کہ'' میں بھی بڑا جلیل القدر شخص ہوں۔دایہ میری خبر گیری کر چکی ۔ اب میں اس کی خبر گیری کروں گا۔''اس سوانحی مضمون کے ذریعے پانچویں جماعت کے بچے کے دل میں یہ نقش بٹھانا آسان ہے کہ ان کے حاکم اعلیٰ بچپن ہی سے جرأت مند، انصاف پسند،حق گو اور جلیل القدر تھے۔اپنی رعایا کی خبر گیری اور انھیں مصائب سے بچانا ان کے خمیر میں شامل ہے۔اس کے مقابلے میں 'تیمور' کے بارے میں اسی کتاب میں لکھا ہے کہ'' اس میں شک نہیں کہ تیمور بڑا دلیر اور اولوالعزم سپاہی تھا۔ اس کی طبیعت میں جس قدر چالاکی اور ہوشیاری تھی ،اسی قدر دغا بازی اور مکاری تھی۔وہ رعایا پروری اور انتظام ملکی کے قاعدوں کو خوب سمجھے ہوئے تھا ،مگر کبھی ان کو عمل میں نہ لایا۔آخری عمر تک فوج کشی اورمعرکہ آرائی میں مشغول رہا۔کسی ملک پہ باقاعدہ سلطنت نہ کی، بلکہ ہمیشہ مخلوق خدا کو ستاتا اورخون کے دریا بہاتا رہا۔اگرچہ وہ مسلمان تھا مگر اس کا آئین جنگ بالکل چنگیز خان مغل کی طرح وحشیانہ تھا۔''یہ دو سوانحی مضامین دو حکم رانوں کے کردار کا تقابل پیش کرتے ہیں اور اس کے ذریعے دو قسم کے رول ماڈل اور ہیرو کا تصور ابھارتے ہیں، نیز دو طرح کی قومی شناختیں بھی سامنے لاتے ہیں:انگریز حکم ران انصاف پسند ا اور رعایا پرور ہیں جب کہ مسلمان بادشاہ خون کے دریا بہانے والے اور وحشیانہ طرز حکم رانی کے حامل ہیں۔اس تقابل کے بعد وہ طلبا اپنے لیے'قومی شناخت' کا تصوراز خودمنتخب کر لیتے ہیں(ایک شناخت کو ردّ کرتے اور دوسری کومنتخب کر لیتے ہیں )جن کی ذہنی تشکیل کا انحصار تعلیمی نصاب جیسے اقتداری متن پر ہے۔ابتدائی درجوں کے تعلیمی اقتداری متون جس طریقے سے طلبا کی ذہنی تشکیل کرتے ہیں،وہ تنقیدی و تجزیاتی

نہیں،تقلیدی ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ متن کا تجزیہ نہیں کرتے اور نہ ان کے پاس تاریخی متون کے تجزیے کے وسائل یعنی علمِ تاریخ ہوتا ہے،لہٰذا ان کے لیے ہر متن،خواہ وہ مستند تاریخی ہو، یا تخیلی ہو،اقتداری حیثیت کا حامل ہوتا اور اسی بنا پر قابلِ یقین اور قابلِ تقلید ہوتا ہے۔ انصاف پسندی اور قومی و انسانی ہمدردی کی صفات کوانگریزی قومی شناخت کے طور پرایک دوسرے مضمون' غلامی کا انسداد' میں ایک تاریخی شہادت سے مزید مستحکم کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اٹھارویں صدی کے ایک انگریز شارپ کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو اس نے انگلستان میں غلامی کے خاتمے کے لیے کیں۔شارپ نے ایک پارچہ باف کے یہاں مزدوری اور ایک دفتر میں محرری کی۔شارپ کی کہانی میں بھی وہی بیانیہ تیکنیک ہے جو لارنس کی کہانی میں برتی گئی ہے: شارپ کو بھی بچپن سے رفاہ خلائق کے کاموں میں دلچسپی تھی اور ابتدا ہی سے ہمت اور استقلال رکھتا تھا۔اس نے رسم غلامی کو انگلستان سے نیست و نابود کر کے چھوڑا اور'' یہ قطعی فیصلہ ہوگیا کہ کوئی غلام ہو،انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی آزاد ہے۔پھر اس جواں مرد،عالی حوصلہ نے لوگوں کا زبردستی جلاوطن کیا جانااور جزائر کو بھجوانا بھی موقوف کرایا۔۱۸۳۴ء میں قلم رو برطانیہ سے سارے غلام یک قلم آزاد کر دیے گئے۔'' اپنے ملک سے غلامی کا انسداد کرنے پر تفاخر کا اظہار اس ملک میں کیا جارہا ہے جسے غلام بنا یا گیا اور جہاں جزائر (انڈیمان) پر باغیوں کو بھجوانا معیوب نہیں سمجھا گیا۔اس سے ایک بات بالکل ظاہر ہے کہ نو آبادیاتی حکمرانوں کی نظر میں انگلستان اور ہندوستان کے باشندے یکساں مرتبے کے حامل نہیں تھے۔اسی طرح ہندوستان کی سرزمین اور انگلستان کی سرزمین میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ایک سرزمین پر قدم رکھتے ہی آپ آزاد ہیں اور دوسری سرزمین کے پینتیس کروڑ لوگ غلام ہیں۔ غلام ملک کے بچوں کو اس کہانی سے یہ باور کرانا بھی مقصود ہے کہ انگلستان تو سرے سے رسم غلامی کے خلاف ہے، لہٰذا اس نے ہندوستان کو غلام نہیں بنایا،اسے (مسلمانوں،مرہٹوں، سکھوں کی) غلامی سے نجات دلائی ہے۔

کتاب میں بعض تاریخی شہروں اور عمارات پر بھی مضامین ہیں۔کلکتہ پر ایک مضمون ہے، جو ہندوستان میں یورپی کلچر کا نمائندہ تھا۔اسی مضمون میں مذکور ہے کہ اورنگ زیب جب مہمات دکن میں مصروف تھا اور اس کی افواج قحط سے خراب حال تھیں تو کرناٹک کی کوٹھی کے ایک انگریز افسر نے بہت سا غلہ اور سامان رسد لشکر شاہی کو پہنچایا تھا۔ اس خدمت شائستہ کے صلے میں بادشاہ نے انگریزوں کو معافی محصول کی سند عطا فرمائی ۔اس سند نے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں کتنے مضبوط کیے، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔اس مضمون میں کلکتہ کے اس حصے کی بہ طور خاص تحسین کی گئی ہے جہاں انگریز رہتے ہیں۔''وہاں کے مکان نہایت عالی شان اور سڑکیں خوش قطع اور فراخ ہیں۔'' ایک مضمون جامع مسجد دہلی پر بھی ہے جو مغل اسلامی کلچر کی یادگار ہے۔تب کلکتہ کے بعد دہلی انگریزی راجدھانی بن چکی تھی اور یہاں بھی انگریزی راج کی ''خوش قطعی اور فراخی'' نظر آنے لگی تھیں۔

'امر اتفاقی' اور 'تحقیق' دو ایسے مضامین ہیں جن میں انسانی شرف کو عقلی غوروفکر سے مشروط کیا گیا ہے۔'' عقل کا رتبہ سب سے اعلیٰ ہے....اس [انسان] کو جو عظمت اور حکومت مخلوقات پر حاصل ہے وہ عقل ہی کی بدولت ہے۔''ہر چند علم کو طاقت سے وابستہ کرنے کا یہ وہی پیراڈائم ہے، جسے بیکن نے متعارف کروایا تھا اور جسے نو آبادیاتی حکمرانوں نے اپنے نظام سلطنت اور اپنے ثقافتی وعلمی مطالعات کی اساس بنایا تھا؛ تاہم اسی پیراڈائم میں طاقت کی ہر قسم کو،خواہ وہ سیاسی ،معاشی،ثقافتی یا علمی ہو،چیلنج کرنے کی صلاحیت

تھی۔نو آبادیات کے خلاف مزاحمت میں اس زاویہ ءنظر کا اہم کردار تھا جو کسی دنیوی امر کو اتفاقی قرار دیتا ہے اور نہ انسانی فہم و بساط سے بالاتر سمجھتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ انگریز استعمار کے خلاف با قاعدہ مزاحمت کا آغاز بنگال سے ہوا تھا،جہاں جدید انگریزی تعلیم کو پہلے رواج ملا تھا۔

حصہ نظم میں اخلاق،علم کی اہمیت،نصیحت آموزی،دوستی،ہندوستان کے موسموں،جانوروں،شہروں،عمارات اور داستان و حکایت پر نظمیں ہیں۔کتاب کے آغاز میں حمد یہ نظم ہے۔۲۷ نظم پاروں میں نو نظمیں اخلاق سے متعلق ہیں۔حالی کی نظم 'اپنی ترقی کرو' حکومتِ وقت کا قصیدہ ہے۔شاعری میں مبالغے کے سخت ترین مخالف،حالی کو حکومت کی حد درجہ مبالغہ آمیز مدح سے عار نہیں ہے۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں تو ہموار ہیں کسب و دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ رستوں میں قزاق و رہزن کا کھٹکا
کرو قدر اس امن و آزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی کہ ہر سو سے آواز یہ ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

حالی نے یہ نظم انیسویں صدی کے اواخر میں انجمنِ پنجاب کی تحریک پر لکھی تھی جو نئی طرز کی نصابی نظمیں لکھوانے کی تحریک تھی، مگر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب برصغیر میں سیاسی مزاحمت عروج پر تھی، اسے شامل نصاب کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ نئی نسل کو باور کرایا جائے کہ حکومت اس کی خیر خواہ ہے اور عوام کو امن، خوشحالی اور ترقی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ان نصابات کا ایک اہم مقصد یہ نظر آتا ہے کہ طالب علموں کو کچھ آئیڈیالوجیکل بیانیے رٹا دیے جائیں اور وہ ان کی روشنی میں اپنے اردگرد کی زندگی سے معاملہ کریں۔حقیقی سماجی صورتِ حال کا بچشم خود مشاہدہ کر کے سماجی طرز عمل اختیار کرنے کے قابل بنانا،ان نصاب سازوں کے پیش نظر بالکل نہیں تھا۔

**سلسلہ نئی دہلی اردو ریڈر: اردو کی نئی پہلی کتاب**

**[دہلی اور دیہاتی مدارس کی پرائمری کی پہلی کتاب]**

**مئولف کا نام درج نہیں**

**تعداد صفحات :۶۴**

**امیر بک ڈپو، ایجوکیشنل پبلشرز اینڈ بک سیلرز، بار اوّل ، ۱۹۳۶ء، نئی سڑک دہلی**

دہلی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اسے ۲۵ فروری، ۱۹۳۶ء کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کے طور پر منظور کیا تھا۔اٹھارہ نثر پاروں اور سات نظموں پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔خدا کی بڑائی (نظم) | ۲۔صبح | ۳۔جوبلی | ۴۔پھلواری |
| ۵۔پھول (نظم) | ۶۔سونے کا انڈا | ۷۔تندرستی | ۸۔گھنٹی کون باندھے |
| ۹۔نہ بھولوں گا اماں تمھاری محبت (نظم) | ۱۰۔شریف | ۱۱۔نیکی کا بدلہ | ۱۲۔پولیس |
| ۱۳۔دھوپ (نظم) | ۱۴۔مور | ۱۵۔اسلم کی سچائی | ۱۶۔ایک گدھا اور گھوڑا |
| ۱۷۔سچائی (نظم) | ۱۸۔ریل گاڑی | ۱۹۔سوہن اور موہن | ۲۰۔کوا (نظم) |
| ۲۱۔انگریزی مہینوں کے نام | ۲۲۔ریچھ کا تماشا | ۲۳۔برسات | ۲۴۔ٹریم کی سیر |
| ۲۵۔سلامت الٰہی رہے بادشاہ (نظم) | | | |

حصہ نثر میں مضامین اور کہانیاں ہیں۔چار مضامین نیچر، ایک صحت اور سات ثقافت سے متعلق ہیں جب کہ چھ دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔کتاب میں جہاں کسی صفحے کا کچھ حصہ خالی تھا، وہاں لطیفہ درج کر دیا گیا ہے۔چار دل چسپ لطائف کتاب کا حصہ ہیں جو فہرست میں شامل نہیں ہیں۔یہ کتاب چوں کہ صوبہ دہلی اور اس کے آس پاس کے ان دیہی علاقوں کے بچوں کے لیے لکھی گئی، جن کی مادری زبان اردو تھی ،اس لیے اس کتاب کا بنیادی مقصد زبان کا علم نہیں ۔یہ ضرور ہے کہ ان کی لسانی مہارت میں اضافہ کرنا اس کتاب کا ایک مقصد مئولف کے پیش نظر تھا،مگر بڑا مقصد پہلی جماعت کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں 'جدید ہندوستانی معاشرت' سے آگاہ کرنا نظر آتا ہے۔اس کتاب سے جس نئی ہندوستانی معاشرت کا تصور ابھرتا ہے وہ انگریزی تمدنی مظاہر سے عبارت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے موسم، پرندوں، جانوروں اور ایک آدھ ثقافتی مظہر (جیسے ریچھ کا تماشا) کا ذکر موجود ہے،مگر اس پر انگریزی تمدنی مظاہر کا بیانیہ حاوی ہے ۔'جوبلی' میں بادشاہ سلامت کی جوبلی کا پرجوش بیان ہے۔''[دہلی کے] گھنٹہ گھر کو سجایا گیا ہے؛ کمپنی باغ، کمیٹی گھر، چاندنی چوک اور سب بازار بجلی کی روشنی سے جگ مگ کر رہے ہیں...آج بادشاہ سلامت کی جوبلی ہے....دفتروں اور مدرسوں میں کئی دن سے چھٹی ہے۔لڑکوں اور لڑکیوں کو مٹھائی،غریبوں اور بھوکوں کو طرح طرح کے کھانے بٹ رہے ہیں۔'' تقریبات کے اس ولولہ خیز بیان سے پہلی جماعت کے بچوں کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کرنا آسان تھا

کہ ہندوستانی رعایا بادشاہ سے بے حد خوش ہے۔(جوبلی کو مغل بادشاہوں کے جلوس کی تقریب کا رنگ دینے کی کوشش ملتی ہے۔)اسی طرح 'پھلواری' کا ذیلی عنوان ہی انگریزی بہار ہے۔''خوب ،یہ بہت خوش رنگ ہیں۔ان پھولوں کی بہار ہی اور ہے۔''پولیس کے ادارے کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے :'' سرکار نے پولیس ہمارے آرام کے لیے بنائی ہے ۔ہم گھر میں پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں ۔پولیس کے سپاہی پہرہ دیتے ہیں۔نہ چور کا ڈر ہے نہ ڈاکو سے خطرہ۔پولیس نہ ہو تو امن رہے نہ چین۔'' حالاں کہ ہندوستان میں پولیس کا دارہ ریاستی استعماری طاقت کے نفاذ کا سب سے اہم ادراہ تھا۔ ریل گاڑی بھی انگریزی تمدن کا مظہر ہے۔'' ریل بھی کیا سواری ہے ۔بہت آرام دیتی ہے۔مہینوں کا سفر دنوں میں اور دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔پہلے یہ بات کہاں تھی۔''ٹریم ،گھنٹہ گھر اور بجلی کا ذکر بھی اسی تفاخر آمیز انداز میں کیا گیا ہے۔''منوہر:جی ہاں مگر ٹریم میں بہت آرام ہے۔لالہ جی:تم نے دیکھا گھنٹہ گھر پر وہ کتنی بڑی گھڑی لگی ہے؟چاروں طرف سے وقت معلوم ہوتا ہے۔چاندنی چوک دہلی کا سب سے بڑا بازار ہے۔دکانیں کیا سجی ہوئی ہیں۔بجلی کی روشنی میں ہر چیز چمک رہی ہے۔''

حصہ نظم میں پہلی نظم حمد یہ ہے۔باقی نظمیں نیچر،ماں کی محبت سے متعلق ہیں اور کتاب کا خاتمہ بادشاہ کی سلامتی کی دعائیہ نظم پر ہوتا ہے۔ایک نظم دھوپ پر ہے۔یہ ان نظموں کی نمائندہ ہے جو انگریزی نظموں سے متاثر ہو کر لکھی گئیں اور یہ خیال نہ کیا گیا کہ سرد اور گرم علاقوں میں فطری مظاہر کی الگ الگ معنویت ہوتی ہے۔اس نظم کا یہ شعر: پڑا کرتی سردی ہے جب زور کی / تو یہ دھوپ لگتی ہے کیسی بھلی ،انگلستان کے لوگوں کے لیے ہی خاص معنویت رکھتا ہے،شمالی ہندوستان کے لوگوں کے لیے نہیں جہاں زور کی گرمی پڑا کرتی ہے۔ایک نظم کوّے پر ہے جس میں کوّے کو ظالم پرندے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔کوّے کی کالے ہندوستانیوں سے جو نسبت بنتی ہے،وہ ظاہر ہے۔اس نسبت پر توجہ اس لیے مبذول ہوتی ہے کہ پوری کتاب میں کسی اور پرندے پر نظم نہیں۔یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوّا ہی ہندوستانی پرندوں کا نمائندہ ہے؟اگر ہم کوّے کو مجازاً کالے ہندوستانی خیال کریں تو نظم میں ان کا تصور چھینا جھپٹی کرنے والوں کا ابھرتا ہے۔

دیکھ لو وہ دیوار پہ کوّا تاک لگائے ہے وہ بیٹھا
ہاتھ میں تھا بچّی کے ٹکڑا آنکھ بچا کر جھٹ لے بھاگا
واہ رے کوّے تیری پھرتی بچّی چھوڑی تو نے روتی

کتاب کی آخری نظم بادشاہ کی سلامتی کی دعاؤں پر مشتمل ہے کہ اسی بادشاہ کے طفیل ہندوستان میں امن ،چین، راحت اور خوشحالی ہے۔نظم میں وہی مبالغہ ہے جو شاہوں کی مدح میں روایتی طور پر ہوا کرتا تھا۔حالاں کہ مغربی تنقیدی اثرات نے غزل اور قصیدے کو جس بنیاد پر مردود ٹھہرایا تھا،وہ مبالغہ ہی تھا۔نظم میں ہندوستاں کو سرسبز کہا گیا ہے اور اس وقت جب (۱۹۳۰ء کی دہائی میں )کساد بازاری نے لوگوں کا جینا مشکل کیا ہوا تھا۔مگر ہمارے نصاب ساز جانتے تھے کہ بچے ہر اس بات پر یقین کر لیتے ہیں جو دل چسپ بیانیہ یا غنائیہ پیرائے میں بیان کی گئی ہو۔

چمکتا رہے شاہ کے سر پہ تاج
رہے ان کا قائم ہمیشہ یہ راج
کریں کیا عنایت کا ان کا بیاں
رعایا پہ اپنی وہ ہیں مہرباں
دعا دیتی ہے ان کو ہر ایک زباں
انھی سے ہے سر سبز ہندوستاں
ہے بچوں کا ہم درد یہ بادشاہ
غریبوں پہ رہتی ہے ہر دم نگاہ
سلامت الٰہی رہے بادشاہ

نہ چور اور ڈاکو کا کھٹکا رہا
ہمیں راج میں ان کے سب کچھ ملا
دعا ہے ہماری یہ تجھ سے خدا
نگہباں ہو تو بادشاہ کا سدا
سلامت الٰہی رہے بادشاہ

اس کتاب میں فقط شہری تمدن پیش کیا گیا ہے؛ دیہی زندگی کا کوئی پہلو سامنے نہیں لایا گیا، حالاں کہ یہ دہلی اور اس کے دیہی علاقوں کے لیے منظور شدہ درسی کتاب تھی۔ دیہی معاشرت پر شہری تمدن کو ترجیح دینے کی وجہ ظاہر ہے۔ جو بلی، ٹریم، ریل گاڑی، گھنٹہ گھر، بجلی دیہات میں نہیں تھیں جن کے ذریعے انگریزی تہذیب کے مفید اور پر شکوہ تصور کو نو خیز اور نئے خیالات کی قبولیت کا غیر معمولی فطری مادہ رکھنے والے ذہنوں میں راسخ کیا جاسکتا تھا؛ نیز انیسویں صدی کے اواخر سے نو آبادیاتی برصغیر میں رائج ہونے والا 'تعلیم و شایستگی' کا تصور بھی اشرافیہ اور شہر تک محدود تھا۔ علاوہ ازیں یہ کتاب ظاہر کرتی ہے کہ اردو زبان ایک نئے 'تہذیبی دور' میں داخل ہو رہی ہے: یہ نئے یورپی تہذیبی مظاہر کے بیان اور ان کی معنویت کے انجذاب سے گزر رہی ہے۔

**اردو کورس، چھٹی جماعت کے لیے**
**ڈاکٹر سر محمد اقبال**
**و**
**حکیم احمد شجاع پاشا**
**تعداد صفحات :۲۵۰**
**گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز، بار پنجم، ۱۹۳۹ء لاہور**

یہ کتاب دیباچے اور فرہنگ کے علاوہ نظم و نثر کے ۴۶ نمونوں پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دعا (نظم) ۲۔ دنیا کی آبادی (۱) ۳۔ سرزمین ہند (نظم) ۴۔ یدھشٹر کا پہلا سبق
۵۔ ہندوستانی بچوں کا گیت (نظم) ۶۔ زمین کی آبادی (۲) ۷۔ صفائی (نظم) ۸۔ راجہ ہریش چندر
۹۔ شرافت (نظم) ۱۰۔ زمین کی سرگزشت (۱) ۱۱۔ دہنا ہاتھ (نظم) ۱۲۔ زمین کی سرگزشت (۲)
۱۳۔ پہلے کام بعد میں آرام (نظم) ۱۴۔ جیمس فرگوسن ۱۵۔ مکڑی اور مکھیاں (نظم) ۱۶۔ زمین کی سرگزشت (۳)

۱۷۔ابر(نظم) ۱۸۔راجہ مایا داس ۱۹۔اپنا گھر (نظم) ۲۰۔نیک دل شہزادہ
۲۱۔سپوت (نظم) ۲۲۔حب الوطنی ۲۳۔زلزلہ(نظم) ۲۴۔مہماں نوازی
۲۵۔رونق بارش ۲۶۔کنگ لیئر ۲۷۔مرغِ اسیر اور صیاد(نظم) ۲۸۔دنیا کی سب سے بڑی چیز
۲۹۔جگنو(نظم) ۳۰۔بینا ۳۱۔سکندر اعظم (۱) ۳۲۔کام(نظم)
۳۳۔تمباکو اور چائے ۳۴۔صبح کی چہل پہل ۳۵۔سکندرِ اعظم (۲) ۳۶۔عزت (نظم)
۳۷۔دانت اور بال ۳۸۔پردیس(نظم) ۳۹۔سکندرِ اعظم (۳) ۴۰۔گنگا کا کنارہ (نظم)
۴۱۔بابر کا بچپن(۱) ۴۲۔میرا جھونپڑا(نظم) ۴۳۔بابر کا بچپن(۲) ۴۴۔محنت (نظم)
۴۵۔بابر کا بچپن (۳) ۴۶۔مکتوبات ۴۷۔فرہنگ

اقبال اور حکیم شجاع نے اس کتاب کا کسی قدر تفصیلی دیباچہ لکھا ہے۔یہ واضح نہیں کہ مؤلفین میں سے دیباچہ کسی ایک نے لکھا ہے یا دونوں نے مل کر؟ایک نے لکھا اور دوسرے نے نظرِ ثانی کی اور کہیں دو ایک سطروں کا اضافہ کر دیا؟ تاہم ایک بات تو غیر مشتبہ ہے کہ پوری کتاب کی تالیف میں دونوں شریک رہے، اس لیے دیباچے کے نکات اور مندرجات کو دونوں مؤلفین کی متفقہ رائے کا نتیجہ قرار دینا چاہیے،مگر ساتھ ہی ہمیں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب سررشتہ ءتعلیم کی ہدایات کی روشنی میں تیار کی گئی تھی۔ ان ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے مؤلفین کے لیے اپنی آرا پیش کرنے یا مندرجات کی تیاری میں اپنی انفرادی آرا کو بنیاد بنانے کی کس قدر گنجائش تھی، یہ ایک اہم سوال ہے ،جس کا جواب کتاب کے توضیحی مطالعے میں خود بخود مل جاتا ہے۔خاص طور پر جب ہم اقبال کے ادب و قوم سے متعلق تصورات کو سامنے رکھتے ہیں۔دیباچے کا آغاز مروجہ درسی کتب کی اس کوتاہی کی نشان دہی سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندازِ تحریر اور طریقہ انتخاب کے اعتبار سے معاصر زندگی کے مطالبات پورا نہیں کرتیں۔گویا معاصر زندگی کے مطالبات کی آگاہی ، ان کی تفہیم اور ان کے سلسلے میں طلبا کو تیار کرنا ہی درسی کتب کا اہم مقصد ہونا چاہیے۔یہ مقصد درسی کتب کے اسلوب اور ان کے مندرجات دونوں سے ظاہر ہونا چاہیے۔نو آبادیاتی ہندوستان میں معاصر زندگی کے مطالبات کا تصور بے حد ٹیڑھا تھا۔بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب یہ کتاب تالیف کی جارہی تھی، ہندوستان میں مزاحمتی تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں؛برطانوی استعمار کی اس چھت میں جگہ جگہ چھید ہونے لگے تھے جو چند دہائیاں پہلے محفوظ و مستحکم تھی ۔لہٰذا معاصر زندگی کے مطالبات کا ایک 'برطانوی یورپی استعماری' تصور تھا اور دوسرا 'ہندوستانی مقامی آزادی کوش' تصور تھا۔تب برصغیر جس معاصر زندگی کا تجربہ کر رہا تھا اور اس کا تصور تشکیل دینے میں جن تاریخی قوتوں کے زیر اثر تھا وہ مقامیت سے مملو تھیں۔دیباچے میں معاصر زندگی کے مطالبات کی نوعیت کی وضاحت نہیں،تاہم اس کی طرف کچھ اشارے ضرور موجود ہیں۔مؤلفین کے نزدیک سابقہ درسی کتب اس لیے معاصر زندگی کے مطالبات پورا کرنے سے قاصر تھیں کہ ان کے زمانہء تالیف میں انتخاب کے مواقع کم تھے اور اردو ادب نے مغربی ادب سے متاثر ہوکر خاص رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔یعنی اردو کا وہ جدید ادب ان کے سامنے موجود نہیں تھا جو مغربی ادب سے متاثر ہونے اور ایک خاص رنگ

اختیارکرنے کا نتیجہ ہے۔اس میں واضح اشارہ ہے کہ معاصر زندگی کے مطالبات 'مغرب کے اثرات سے پیدا ہونے والا جدیداردو ادب' ہی سمجھتا اور پورا کرتا ہے ، اور اسی کی تدریس نہیں کی گئی۔تاریخی طور پر یہ بات درست ہے یا نہیں، اس سے ہٹ کر دیکھنے والی اہم بات یہ ہے کہ مؤلفین اس بات پر اصرار کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ معاصر زندگی اس ادب ہی میں ظاہر ہوتی ہے جو محض زمانی طور پر نیا نہ ہو بلکہ اپنے زمانے کی 'روح' کا علم بردار ہو اور یہی ادب نئی نسل کو پڑھایا جانا چاہیے(اگر چہ پرانے اساتذہ فن کے نتائج فکر کو شامل نصاب کرنے کا ذکر موجود ہے ،مگر اصرار بہ ہر حال ''زمانہ ء حال کے ان انشاپردازوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر'' پر ہے ''جنھوں نے اردو کو ایسی زبان بنانے کے لیے ان تھک اور کام یاب کوششیں کی ہیں جو موجودہ ضروریات کے مطابق اور ادائے مطالب پر قادر ہو''۔)۔دیباچے کے نکات اس سوال کو بالواسطہ انگیخت کرتے ہیں کہ کیا 'مغرب کے اثرات سے پیدا ہونے والا اردو کا تمام جدید ادب' معاصر زندگی کے مطالبات پورا کرتا ہے ؟ یہ سوال اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ معاصر زندگی کا تصور تو کسی فاعل کے بغیر کیا جاسکتا ہے،مگر زندگی کے مطالبات کا تصور کسی فاعل:میں / ہم یا وہ کے بغیر ممکن نہیں۔یعنی معاصر زندگی کے مطالبات لازماً کسی نہ کسی کی طرف سے ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ان کا مخاطب بھی ہوتا ہے۔نیز مؤلفین نے 'مغربی ادب سے متاثر ہوکر خاص رنگ اختیار کرنے والے اردو ادب' کا ذکر کیا ہے۔اگرچہ اس خاص رنگ کی وضاحت نہیں،مگر اتنی بات واضح ہے کہ مؤلفین محض مغربی ادب کے سطحی اثرات قبول کرنے والا ادب مراد نہیں لے رہے ، بلکہ ان کا مقصوددو ادبی روایتوں کے امتزاج سے پیدا ہونے والا ایک نئے اسلوب اور کینڈے کا ادب ہے۔

مؤلفین کی یہ وضاحت مذکورہ بالا سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش قرار دی جاسکتی ہے:''مضامین زیادہ تر ایسے ہی منتخب کیے گئے ہیں،جن میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو،تا کہ طالب علم اس کے مطالعے کے بعد کشاکش حیات میں زیادہ استقلال ،زیادہ خود داری اور زیادہ اعتماد سے حصہ لے سکیں۔'' ہر چند اقبال کی فکر میں کشاکشِ حیات ایک نیم فلسفیانہ تصور ہے اوراس میں کسی مخصوص صورتِ حال کی طرف اشارے کے بجائے زندگی کی عمومی جہد وسعی کا کنایہ ہے ،تاہم اگر اسے معاصر زندگی کے مطالبات کے ساتھ جوڑیں تو معلوم ہوگا کہ کشاکشِ حیات سے مراد معاصر قومی زندگی کی کش مکش ہے۔طالب علموں کو اسی زندگی کے دھارے میں شامل ہونا اور اپنا کردار ادا کرنا ہے،لہٰذا انھیں زندگی کے روشن پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کے قابل بنانا ضروری ہے۔ایک پر امید زاویہ ء نگاہ ''استقلال،خودداری اور اعتماد'' جیسی کرداری صفات کی نمود کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہاں ادب کی تدریس کے بنیادی مقصد کی نشان دہی کی گئی ہے۔ادب کی تدریس کا مقصد کسی خاص نظریے کی ترسیل نہیں ،بلکہ انسانی شخصیت کی تہذیب ہے۔''حقیقت میں ادبیات کی تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہیے کہ ادبی ذوق کی تربیت کے ساتھ ساتھ طلبا کی وسیع النظری اور ان کے دل و دماغ کی جامعیت نشوونما پائے۔''

حسن سے مسرت حاصل کرنے اور وسیع النظری اور دل و دماغ کی جامعیت کی نشوونما،ادب کے مطالعے کے وہ عمومی مقاصد ہیں،جن کا تصور نجی زندگی میں کیا جاسکتا ہے یا پھر ایک ایسے معاشرے میں جہاں انسانی آزادی کو طاقت کی کسی کش مکش سے خطرہ نہ

ہو۔چناں چہ دیباچے میں ادبیات کی تعلیم کے 'مثالی' مقصد بیان کرنے کے بعد یہ واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ '' اور اس امر کا لحاظ تو بالخصوص رکھا گیا ہے کہ منتخبہ نظم ونثر پر وطنیت کا رنگ غالب ہو تا کہ طلبا کے دلوں میں اخلاقِ حسنہ اورعلم ادب کی تحصیل کے دوران ہی اپنے وطن کی محبت کا پاک جذبہ موجزن ہو اور وہ ہندوستان کو جس عظمت کے نشان اس مجموعہ میں جگہ جگہ موجود ہیں،زیادہ پرعظمت بنانے میں حصہ لیں۔'' کیا وطنیت کا رنگ غالب کرنے کی شعوری کوشش ،دل و دماغ کی جامعیت کی نشوونما کے مقصد سے ہم آہنگ ہے؟وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے،جومستور حالت میں ہمہ وقت موجود ہوتا ہے،مگر جوں ہی آدمی وطن سے دور ہوتایا وطن کسی خطرے سے دوچارہوتا ہے،یہ جذبہ پوری شدّت سے،بغیر کسی خارجی تحریک کے،از خود بیدار ہوجاتا ہے ،جب کہ وطنیت ،ایک آئیڈیالوجی ہے؛اسے'کسی' نےتشکیل دیا ہے؛کسی مقصد کے تحت تشکیل دیا ہے۔ وطن کی محبت اور وطنیت ،ایک ہی تصویر کے دو رخ نہیں ہیں۔اس سے ہٹ کر کہ وطنیت کی آئیڈیالوجی کیاتھی،کس نے کس مقصد کےحصول کی خاطر اسے وضع کیا اور طلبا کی شخصیتوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی،دیکھنے والی بات یہ ہے کہ یہ طلبا کی اس ذہنی نشوونما کے تصور سے ٹکراتی ہے جسے وسیع النظری اور دل و دماغ کی جامعیت کہا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومی سطح پر ادبیات کی تدریس کے منصوبے ہی میں ایک فکری الجھن اور کشمکش موجود ہوتی ہے۔ادبیات کی روح ،مسرتِ جمال اورفکری و ثقافتی وسیع النظری سے عبارت ہے،جب کہ تعلیم و تدریس کا قومی زاویہ متعین قومی تصورات کا علم بردار ہوتا ہے۔اس طور دونوں کا رخ دومختلف سمتوں میں ہوتا ہے اور دونوں میں کشمکش کا باعث بھی یہی ہے۔ ہر چند ادبیات کی تدریس کے مقاصد میں ادبیات کی روح کے احترام کا ذکر موجود ہوتا ہے،مگرحقیقتاً متعین قومی تصورات حاوی رہتے ہیں۔زیرِ نظر کتاب کے مؤلفین نے جس خاص رنگ کے جدید ادب کی تدریس کا ذکر ابتدائیے میں کیا ہے ،وہ وطنیت کے رنگ میں لکھا ہوا ادب ہی ہے۔ کتاب کے مندرجات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں علامہ اقبال بھی شامل ہیں اور وہ وطنیت کے تصور پرمبنی ادب اس وقت شاملِ نصاب کر رہے ہیں ،جب وہ خود اس تصور سے تائب ہو چکے تھے۔وطنیت کی جگہ ،ملت کے نظریے کا حامی اور مبلّغ بن چکے تھے۔قیامِ یورپ کے زمانے ہی میں اقبال وطنیت کےنظریے کے خطرات سے آگاہ ہونے لگے تھے۔اپنے لیکچر 'ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر' (۱۹۱۰ء)میں قومیت کے وطنی تصور پرتنقید کی ہے۔اس کے بعد اقبال نے اپنی شاعری اور نثر میں اگر کسی نظریے پرغیر مصالحانہ انداز میں اور شدو مد سے تنقید کی ہے تو وہ وطنیت کا نظریہ ہے۔اس کے باوجود اقبال نے اس نصاب میں وہ تمام مندرجات شامل کرنا کیسے گورار کیے جو وطنیت کے نظریے کی تبلیغ کرتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں اقبال کے تعلیمی تصور اور تعلیمی کوششوں پر نئے زاویے سے غور کرنے پر مائل کرتا ہے۔(اس موضوع پر تفصیلی بحث مقدمے میں کی جائے گی۔)

دیباچے میں اخلاقی مضامین کے بارے میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ ''[ان کے ]انتخاب میں اس امر کوملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان کا اسلوبِ بیان ایسا ہو جو طالب علم کو کم زور اور بزدل بنانے کے بجائے نیک اور بہادر بنائے۔''

کتاب کے نثری مندرجات میں چند ایک سائنسی ، معلوماتی مضامین(زمین کی سرگزشت، دنیا کی آبادی،تمباکو اور چائے،دانت اور بال)اور زیادہ تر تاریخی و اخلاقی مضامین(یدھشٹر کا پہلا سبق،راجہ ہریش چندر،راجہ مایاداس،نیک دل شہزادہ،مہماں نوازی،کنگ لیئر،بینا،جیمس فرگوسن،سکندر اعظم،بابر،حب الوطنی)شامل ہیں۔

زبان و ادب کی نصابی کتب جن خیالات کی تعلیم کو اپنا مقصود بناتی ہیں،ان کا اہم وسیلہ کہانی ہوتی ہے۔اخلاق اور تاریخی مضامین کو بھی کہانی کے پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔اس کتاب میں بھی 'مخصوص تصورات' کی تعلیم کا اہم ذریعہ کہانی ہی ہے۔اس کتاب میں شامل تمام اخلاقی،تاریخی کہانیوں کا امتیاز'امتزاجی ثقافتی تصور' ہے ۔یہ تصور،ہندو،مسلم اور یورپی عناصر سے مرکب ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کتاب ایک ایسے ہندوستان سے طلبا کو متعارف کرواتی ہے جس میں تین تہذیبی دھارے شامل ہو چکے ہیں۔چناں چہ کتاب میں چھٹی کے طلبا کے لیے جن اخلاقی اور دل چسپ قصوں کا انتخاب کیا گیا ہے،وہ ہندو،مسلم اور یورپی تاریخ سے لیے گئے ہیں۔تاہم واضح رہے کہ ثقافت کا امتزاجی تصور غیرنامیاتی ہے۔اس تصور میں سہ گانہ ثقافتی عناصر الگ الگ رہتے ہیں؛ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو،ایک نئی ثقافت میں ضم ہوتے محسوس نہیں ہوتے۔یعنی کتاب میں کوئی قصہ ہندو تاریخ سے،کوئی مسلم ثقافت سے اور کوئی کہانی یورپی تہذیب سے لی گئی ہے،مگر کوئی ایسی کہانی شامل نہیں جس میں تینوں تہذیبوں کے نمائندہ عناصر یک جا ہوں۔ہندو اور مسلم تاریخ سے جتنے قصے منتخب کیے گئے ہیں ،وہ قدیم ہیں۔یہ کہنا مشکل ہے کہ منتخب قصے ان تہذیبوں کے ممتاز اور نمائندہ قصے ہیں۔تاہم انھیں معاصر عہد میں ''موزوں' بنا کر پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ایک اور بات بھی واضح ہے۔'امتزاجی ثقافتی تصور'میں تینوں ثقافتوں کا درجہ یکساں نہیں۔یورپی ثقافت،دیگر ثقافتوں سے ایک ایسے فاصلے پر رہتی ہے جہاں سے وہ اپنی فضیلت کا اظہار کرسکے؛دیگر ثقافتوں کی اپنے پیراڈائم میں تعبیر کرسکے اور ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کر سکے۔ان کہانیوں کا اگر کوئی موتیف ہوسکتا ہے تو وہ'آقا کی موجودگی' ہے۔

'یدھشٹر کا پہلا سبق'میں یدھشٹر کو اس کے گورو،درونا چاریہ نے پہلا سبق یہ دیا کہ'' سچ بولو اور غصے سے پرہیز کرو۔''یدھشٹر نے اسے یاد کرنے میں کئی دن لگادیے۔جب اس کے گورو نے ناراض ہوکر تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ''...سبق کا پہلا حصہ'سچ بولو' مجھے ابھی تک یادنہیں ہوا،کبھی کبھی جھوٹ منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔جب تک دل سے جھوٹ کا خیال بھی دور نہ ہو جائے تب تک میں کیسے کہہ دوں کہ مجھے سبق یاد ہوگیا ہے اور خاص کر اس حالت میں جب کہ میرا سبق ہی یہ ہے''سچ بولو اور غصہ سے پرہیز کرو۔'' اس بات پر گورو کو غصہ آیا،اس نے یدھشٹر کو پیٹ ڈالا ۔وہ چپ چاپ گورو کی مار سہتا رہا۔راجہ کا بیٹا ہونے کے باوجود گورو پر غصے نہیں ہوا۔''جنھوں نے ہندوؤں کی مشہور کتاب مہا بھارت کا کبھی مطالعہ کیا ہے،وہ جانتے ہیں کہ یدھشٹر نے گورو درونا اچاریہ کی امیدوں کو پورا کیا۔''یدھشٹر نے ثابت کیا کہ سبق کا یاد کرنا محض کسی بات کو یاد رکھنا نہیں،اسے اپنے مزاج اور کردار کا حصہ بنانا ہے یا زبان اور طبیعت میں ہم آہنگی قائم کرنا ہے۔تعلیم کا یہ ایک مثالی تصور ہے،جسے فقط اس تعلیمی نظام میں تصور کیا جاسکتا ہے،جس کی بنیاد گیان پر ہو؛ذات کے اس عرفان پر ہوجس میں نفس واحد خود کو کسی عظیم ترین ماورائی ہستی کے روبرو محسوس کرتا ہے اور اس لیے

جو کچھ زبان سے کہتا ہے،اس کی سچائی کی تصدیق اس کا قلب کر رہا ہوتا ہے۔....اب سوال یہ ہے کہ نو آبادیاتی سیاق میں ’’سچ بولو اور غصے سے پرہیز کرو‘‘ کی کیا معنویت ہے؟اگر ہم کہانی کے نیم تاریخی،اساطیری کرداروں کو نو آبادیاتی عہد کے حقیقی کرداروں سے بدل دیں تو یہ معنویت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔انگریز حکام نئے زمانے کے درونا چاریہ ہیں جو ہندوستانی راجاؤں کی اولادوں کو ’مہذب تعلیم‘ دے رہے ہیں۔نو آبادیاتی سیاق میں مہذب ہونے کا مطلب غصے سے پرہیز ہے۔غصہ اپنی اصل میں منفی جذبہ نہیں۔غصہ دراصل ایک ایسی اچانک،شدید جذباتی صورتِ حال ہے جو آدمی کو از حد مبہم طریقے سے آگاہ کرتی ہے کہ وہ کس کے مقابل ہے اور اس کے مقابل کس قدر کم زور ہے۔ہر مزاحمت کی تہ میں غصہ موجود ہوتا ہے۔غصے کی مبہم آگاہی جب واضح ہوجاتی ہے اور’مقابل‘ کا ناک نقشہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے تو یہی مزاحمت ہے۔ لہٰذا نو آبادیاتی سیاق میں غصے پر قابو پانے کا مطلب اپنے مزاحمت کے جذبات کچل دینا اور ایک بے ضرر شخصیت میں ڈھل جانا ہے۔سرسید جسے تربیت کہتے تھے،وہ غصے اور ایجی ٹیشن سے پرہیز ہے۔گیان کی تعلیم میں جس ماورائی ہستی پر عقیدہ ہوتا ہے،وہ نو آبادیاتی نظامِ تعلیم میں ’حاکم اور بادشاہ‘ ہوتا ہے۔اس سے وفاداری تعلیم کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔اسی عہد کی اگر ہم دوسری درسی کتابوں پر نظر ڈالیں تو ان باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔

یہی مفہوم ’مہمان نوازی‘ میں بھی موجود ہے۔یہ ابراہیم بن سلیمان کی کہانی ہے جو اپنی جان کے خوف سے شام بھاگ گیا تھا۔جب بنی عباس کے پہلے خلیفہ سفاح (جسے مؤلفین نے ’’مسلمانوں کا دینی بادشاہ‘‘ لکھا ہے۔گویا خلیفہ کہنا نامناسب تھا۔کیا سلطنت عثمانیہ اور خلافت کے خاتمے سے اس کا کوئی تعلق ہے؟سوچنے والی بات ہے!)نے منادی کرادی کہ لوگ (بنی امیہ کے )اپنے گھروں کو واپس آسکتے ہیں تو ابراہیم بن سلیمان سیدھا خلیفہ کے پاس گیا۔خلیفہ کے استفسار پر اس نے بیان کیا کہ وہ کس طرح جان بچا کر کوفہ پہنچا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہاں ایک عالی شان مکان میں پناہ لی۔اہلِ خانہ سے التجا کی کہ’’ خدا کے واسطے مجھے اپنے یہاں پناہ دیجیے۔‘‘التجا قبول ہوئی۔گھر کا نوجوان مالک روزانہ گھر سے چلا جاتا اور واپسی پر پریشان ہوتا۔ابراہیم کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل (ابراہیم بن سلیمان) کی تلاش میں جاتا ہے۔‘‘ اپنا نام سن کر خوف سے کانپ گیا’’مگر اپنے دل میں ارادہ کیا کہ خواہ میں قتل ہی کیوں نہ کر دیا جاؤں،اصل حقیقت اسے بتا دوں۔‘‘ چناں چہ اس نے بتادیا کہ وہی اس نوجوان کے باپ کا قاتل ہے۔’’میری صورت دیکھ کر اس نوجوان پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔‘‘ نو جوان نے حسرت بھرے لہجے میں کہا’’ پناہ میں آنے والے کو قتل کرنا شرافت کے خلاف ہے۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً یہاں سے کہیں دور چلا جائے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا خیال پھر تیری طرف سے بدل جائے اور انتقام کے جوش سے میں تجھے قتل کر ڈالوں۔‘‘نوجوان نے ابراہیم بن سلیمان کو پانچ سو اشرفیاں دیں اور وہ اس کی مہمان نوازی پر متحیر ہوکر وہاں سے چلا۔عرب مسلمانوں کی تاریخ کا یہ واقعہ،میزبانی کے غیر معمولی آداب کی مثال ہے۔اس کہانی کا نقطہ ء ارتکاز اپنے انتقام کے جذبے کو شرافت پر قربان کرنا ہے۔گویا یہ باور کرایا جارہا ہے کہ غصے، انتقام،مزاحمت اور تشدد کے جذبات شرافت کے خلاف ہیں۔

یہی معانی ’دنیا کی سب سے بڑی چیز‘ میں ملتے ہیں۔یہ سبق اکبر کے سوالات اور بیر بر کے جوابات پر مشتمل ہے۔اکبر

دریافت کرتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی چیز کیا ہے اور وہ کیا کھاتی اور کیا پیتی ہے؟ بیر بر ایک لڑکے سے معلوم کر کے اکبر کے سوال کا جواب دیتا ہے۔ وہ لڑکا بیر بر کو راستے میں ملا تھا۔وہ ایک ایک کر کے چنے چبا رہا تھا۔ بیر بر نے حیرت سے وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ کئی دن کا بھوکا ہونے کی وجہ سے ایک ایک کر کے چنے چبا رہا ہے کہ شاید اس طرح تسلی ہوجائے ۔بیر بر اسے گھر لے آیا۔وہی لڑکا بیر بر کو بتاتا ہے کہ سب سے بڑی چیز عقل ہے جو غم کھاتی اور غصہ پیتی ہے۔اس کا ایک ایک کر کے چنے چبانا بھوک سے پیدا ہونے والے غصے کو پینے اور غم کھانے کی علامت بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مغل مسلمانوں کی تاریخ میں اکبر واحد بادشاہ ہے جسے انگریز پسند کرتے تھے اور اسے ہندومسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی علامت سمجھا جاتا تھا۔یہ کتاب بھی اس اتحاد کی داعی ہے، اس لیے اکبراور بیر بر کی کہانی کے ذریعے ایک تو ہندومسلم اتحاد کی تاریخی گواہی لانا ہے،دوسرا یہ باور کرانا ہے کہ اخلاقی اقدار میں سب سے بڑی قدرغم کھانا اور غصہ پینا ہے۔اہم بات یہ نہیں کہ عقل کو دنیا کی سب سے بڑی چیز کے طور پر پیش کیا گیا ہے؛اہم بات یہ ہے کہ عقل کی بڑائی کوغم کھانے اور غصہ پینے سے مشروط کیا گیا ہے۔گویا عقل منداس کہانی کا وہ بچہ ہے جو کئی روز سے بھوکا ہے اور کھانے کو فقط چند چنے اس کے پاس ہیں۔وہ بھوک کے پیدا کردہ غم اور غصے کو اپنی عقل کے تابع رکھے۔یہی کچھ یدھشٹر کرتا ہے۔وہ اپنے غصے کو'علم' کے تابع رکھتا ہے۔گویا عقل اور علم کا سب سے بڑا کام ان شدید جذبات کی بیخ کنی ہے،جو ایک حقیقی، واقعی(نوآبادیاتی) صورتِ حال سے تحریک پاتے ہیں۔

'راجہ ہریش چندر' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔رشی وشوامتر،راجہ کو آزمانے کے لیے اس سے راج لیتے اور ہزار اشرفیاں بطور نذرانہ طلب کرتے ہیں۔راج پاٹ کے بعد اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔چناں چہ راجہ،خودکو،اپنی بیوی تارا اور اکلوتے بیٹے روہت کو بیچ کر نذرانے کی اشرفیاں اکٹھی کرتے اور رشی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔تارا ایک مہاجن کے یہاں اور راجہ خود ایک شمشان گھاٹ پرنوکری کر لیتے ہیں۔روہت کو سانپ ڈستا ہے۔اسے مردہ سمجھ کر تارا شمشان گھاٹ جلانے لاتی ہے،مگر ہریش چندر اسے پہچان لینے کے باوجود کہتا ہے کہ'' جب تک روپیہ نہ لاؤ گی،نہ جلانے دوں گا۔مالک کا یہی حکم ہے۔'' تارا کو سپاہی پکڑ لیتے ہیں ۔اسے ایک مطلوب قاتل قرار دے کر راجہ کے سامنے لاتے ہیں۔قتل کا حکم ملتا ہے،جس کی تعمیل کے لیے تارا کو ہریش چندر کے پاس شمشان گھاٹ لایا جاتا ہے۔یہ اس کی آزمائش کا سب سے کڑا لمحہ تھا۔وہ حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوجاتا ہے ۔اسی لمحے وشوامتر آتے ہیں۔ ہریش چندرکو'' گلے سے لگالیا اور کہا بیٹا! میں آزما رہا تھا کہ تو کس قدر دھرم کا پابند ہے۔معلوم ہوا کہ دنیا جو تیری تعریف کرتی ہے،وہ غلط نہیں ہے۔'' راجہ کا بیٹا فقط بے ہوش تھا۔وہ زندہ سلامت ماں باپ سے آملا۔بالآخر وشوامتر نے بڑے اصرار سے ان کا راج ان کے حوالے کیا اور خود بنوں میں عبادت کرنے چلا گیا۔اس کہانی کا نقطہء ارتکاز''تعمیل حکم'' ہے۔دھرم کی پابندی کا دوسرانام اپنے حاکم کی فرماں برداری ہے۔خواہ یہ حاکم رشی کی صورت میں ہویا شمشان گھاٹ کا مالک ہو۔اگر ہم غور کریں تو یہاں بھی اپنے فطری جذبات پرقابو رکھنے پر اصرار موجود ہے۔ویسے اس کہانی کی ایک اور معنویت بے حد واضح ہے۔ ہریش چندر راجہ ہے،مگر رشی کی صورت میں ایک اعلیٰ تر حاکم اس کے راج کرنے کی صلاحیت میں یقین نہیں رکھتا۔چناں چہ اسے طرح طرح کی

سختیوں اور قربانیوں کی آزمائش سے گذارا جاتا ہے۔ پھر کہیں ،اس کی اہلیت تسلیم کی جاتی ہے۔ برٹش گورنمنٹ، ہندوستانیوں کی سیلف گورنمنٹ کے تصور میں کیا یہی منطق پیش نہیں کرتی تھی؟ نئے زمانے کے یہ وشوامتر بار بار کہتے تھے کہ وہ فقط ہندوستانیوں کی تربیت کررہے ہیں تا کہ وہ حکومتِ خود اختیاری کے اہل ہوسکیں۔

مؤلفین نے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ انھوں نے خاص طور پر کوشش کی ہے کہ ''منتخبہ نظم ونثر پر وطنیت کا رنگ غالب ہو تاکہ طلبا کے دلوں میں اخلاقِ حسنہ اور علم ادب کی تحصیل کے دوران میں اپنے وطن کی محبت کا پاک جذبہ موجزن ہو۔'' وطنیت کی بنیاد وطن کے ارضی تصور پر ہے۔وطنیت کی بنیاد پر وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی موزوں صورت وطن کے ارضی مظاہر کی پر جوش تعریف وتحسین ہے۔نظموں میں یہ طریق کار موجود ہے،مگر نثر میں نہیں۔'حبّ الوطنی' میں وطن پر قربان ہونے کی جس کہانی کو بہ طور مثال پیش کیا گیا ہے،وہ مقامی نہیں یورپی ہے۔ہوریشس،روم کوسکسنوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرتا ہے۔ ہوریشس دریائے ٹائبر کے پل پر پامردی سے لڑتا ہے۔ پل کو اس کے ہم وطن توڑ دیتے ہیں اور اپنے وطن کی طرف ظالم سکسنوں کی پیش قدمی روک دیتے ہیں۔

> روم کی فوج کومجتمع ہونے کا کافی وقت مل گیا اور ہوریشس کی بے نظیر قربانی سے روم کوسکسنوں کے ظلم سے بچا لیا۔ اس کے اس دلیرانہ کام نے روم کے ہر ایک باشندے کے دل میں حبّ وطن کی آگ مشتعل کردی اور انھوں نے اس زور سے دشمن پر حملہ کیا کہ تاب نہ لا کر انھیں میدان کو چھوڑ کر بھاگتے ہی بنی۔آج ہوریشس کا جسم اس دنیائے فانی میں موجود نہیں،لیکن اٹلی کا بچہ بچہ اس کے نام کو عزت سے یاد کرتا ہے۔

'ہوریشس کی بے نظیر قربانی' حوصلہ انگیز ہے اور یہ ثابت بھی کرتی ہے کہ وطن کی محبت دنیا کے تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے،مگر غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں ہندوستان کی محبت پیدا کرنے کے لیے ہندوستان ہی سے کسی کہانی کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا یہ کہانی فقط اس 'امتزاجی ثقافتی تصور' کو رو بہ عمل لانے کی کوشش کا نتیجہ ہے،جو سررشتۂ تعلیم کی ہدایت تھا۔ یہ تسلیم کرنا تو مشکل ہے کہ چوں کہ حبّ الوطنی پہ کہانی شامل کرنا تھی، یہ مل گئی اور شامل کر لی۔اگر ہم یہ دلیل مان بھی لیں تو ان مضمرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو نو آبادیاتی سیاق میں اس کہانی کی قرأت سے نمود کرنے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کہانی وطنیت کے بنیادی تصور سے متصادم نہیں،مگر ہندوستانی وطنیت کے آدرش کے مطابق ہرگز نہیں؛اس لیے کہ وطنیت کا بنیادی تصور اپنی اصل میں ارضی ہے اور ہندوستانی وطنیت ،ہندوستانی ارض کی محبت پر استوار ہے۔قصہ یہ ہے کہ وطنیت ایک یورپی تصور تھا، اس لیے اس کی عملی مثال کے لیے بھی ایک یورپی متن کام میں لایا گیا۔ہندوستانی ارض کی محبت میں ہندوستانی لوگوں نے ہزاروں جانوں کے نذرانے پیش کیے،مگران کی کہانیوں میں ''،سکسن'' وہ انگریز ہیں جو انھیں حبّ الوطنی کی تعلیم دے رہے ہیں۔لہٰذا ان کی کہانیاں کیوں کر شامل کی جاتیں؟ یہ کہانی ہندوستانی تاریخ کے بارے میں ایک ''خاموش رائے'' تو ضرور پیش کرتی ہے کہ یہ وطن پر قربان ہونے کی مثالوں سے خالی ہے یا وہ مثالیں قابلِ ذکر نہیں۔تاہم ایک غور طلب بات اور بھی ہے۔ یہ کتاب پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں تالیف

ہوئی۔ یہ عرصہ دوسری عالمی جنگ کے خطرے کی گھنٹیوں سے برابر گونج رہا تھا۔ جن یورپی علاقوں سے یہ گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں، وہ سیکسنوں کے علاقے (مثلاً جرمنی) تھے۔ برطانوی ہندوستان کو ''ہندوستان کی محبت'' میں سرشار ایسے جاں نثاروں کی ایک بار پھر تلاش تھی جو سیکسنوں کے خلاف برطانوی اتحادی افواج میں شامل ہوکر اپنی جانوں کے نذرانے دے سکیں۔

وطن کی محبت کے علاوہ، حقیقی محبت کا تصور بھی یورپی متن کی صورت پیش کیا گیا ہے۔'کنگ لیئر' میں کنگ لیئر اور اس کی تین بیٹیوں: گائز بیل، ریگن اور کارڈیلیا کی کہانی پیش ہوئی ہے۔ یہ شیکسپیر کے مشہور المیہ ڈرامے 'کنگ لیئر' کی تلخیص ہے۔ کنگ لیئر اپنی جائداد اپنی تینوں بیٹیوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے مگر زیادہ حصہ اس کو دینا چاہتا ہے جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہو۔ بڑی دونوں بیٹیاں جھوٹ موٹ کی محبت کا نہایت مبالغہ آمیز اظہار کرتی ہیں، مگر چھوٹی کارڈیلیا کو خوشامد سے نفرت ہے۔'' میں اپنے باپ سے اس قدر محبت کرتی ہوں، جس قدر محبت کرنا ایک سعادت مند بیٹی کا فرض ہے۔''لیئر سچ اور خوشامد میں فرق نہ کرنے کے ''ہمارشیا'' کے سبب، کارڈیلیا سے ناراض ہوکر اپنی جائداد میں اس کا حصہ بھی بڑی بیٹیوں کو دے دیتا ہے۔ بڑی بیٹیاں جلد ہی شاہی کر وفر سے محروم باپ کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ وہ پاگل ہوکر جنگلوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ کنٹ کے نواب کو لیئر کی کسمپرسی کی خبر ملی تو وہ اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ وہ فرانس پہنچ کر کارڈیلیا کو آگاہ کرتا ہے جو اب شاہ فرانس کی ملکہ ہے۔ کارڈیلیا اور شاہ فرانس، بڑی بیٹیوں سے سلطنت چھین لیتے ہیں۔ کارڈیلیا باپ کا علاج کرواتی ہے۔ لیئر کو جب یہ سب علم ہوتا ہے تو دعائیں دیتے ہوئے کہتا ہے'' بیٹی شاید یہ آنسو اس ظلم کے داغوں کو مٹا دیں، جو میں نے تم سے کیا تھا۔'' بڑی بیٹیاں آپس کی دشمنی کا شکار ہوکر مر جاتی ہیں۔.... عجیب بات یہ ہے کہ معمولی تبدیلی کے ساتھ یہی کہانی مشرق میں بھی موجود ہے۔ میرامن کی 'باغ و بہار' میں بصرے کی ملکہ کا قصہ۔ دونوں میں بڑا فرق فقط یہ ہے کہ بصرے کی ملکہ میں سات بہنوں کا اور کنگ لیئر میں تین بہنوں کا قصہ ہے۔ کیا مؤلفین حقیقی اور بے ریا محبت کی اس کہانی کے مشرقی متن سے آگاہ نہیں تھے؟ یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ حب الوطنی کی بے نظیر مثال کی طرح بے ریا محبت کی بے نظیر مثال بھی یورپ سے لائی گئی ہے اور یہ 'امتزاجی ثقافتی تصور' کے عین مطابق تو ہے جس میں یورپی ثقافت، مشرقی/ ہندوستانی ثقافت کی تعلیم و تطہیر کرتی ہے، نیز یہ ایک اور ثقافتی تدبیر کو بھی منکشف کرتی ہے۔ یورپی اور ایشیائی متن جب اپنی بعض مماثلتوں یا کسی تاریخی ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں تو مذکورہ تدبیر یورپی متن کو مرکز میں جگہ دیتی اور ایشیائی متن کو حاشیے پر دھکیل دیتی ہے۔ اسے نو آبادیاتی ثقافتی غلبے کا براہِ راست نفسیاتی اثر کہنا چاہیے کہ ایشیائی متن کو خاموشی کی دبیز چادر چھپا لیتی ہے اور اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ اس سے بھی سنگین بات یہ ہے کہ ایشیائی / مشرقی متن اپنی خاموشی میں گویا نہیں ہوتا؛ وہ بس فراموش ہو جانے کی صورتِ حال میں مبتلا ہوتا ہے۔

یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ کتاب میں جنگی ہیرو دو مرتبہ ظاہر ہوتا ہے اور دونوں مرتبہ یورپی ہے۔ ہوریشس اور سکندر اعظم۔ بابر بھی فاتح تھا، مگر کتاب میں فقط اس کے بچپن کو تین قسطوں میں پھیلا کر پیش کیا گیا ہے۔ شاید اس کی باقی زندگی کی واقعات 'امتزاجی ثقافتی تصور' سے ہم آہنگ نہیں: وہ ہندو راجاؤں سے جنگیں کرتا ہے۔ یہ بھی ایک توجہ طلب بات ہے کہ بابر کے بچپن کے

جرأت آمیز واقعات سے، چھٹی کے طالب علموں کو انسپائر کرنے کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔مگر سکندر یونانی کس سبب سے ہندوستانیوں کے لیے ہیرو ہے؟ کیا جنگی ہیرو سے مراد ایک ایسا بہادر جنگ جو ہے، جسے اپنے مقبوضات کی سرحدیں مسلسل پھیلانے کا جنون ہو یا وہ بہادر سورما جو اپنے وطن کی مٹی کی حفاظت کرنے میں یقین رکھتا ہے؟ یہ کتاب اوّل الذکر کو ہیرو تسلیم کرتی محسوس ہوتی ہے۔لہٰذا سکندر ہیرو ہے اور راجہ پورس (جسے پورد لکھا گیا ہے) نہیں۔ ہیرو کے مذکورہ تصور کی پابندی کی وجہ سے ہندوستان کا فاتح ، ہندوستانیوں کے لیے ہیرو بن جاتا ہے اور ہندوستانی اس فاتح کے مقابلے میں جس بے جگری، شان اور دھج سے لڑتا ہے، وہ اسے ہیرو نہیں بناتی۔

> دریا کے پار راجہ پورد کا لشکر مقابلے کو تیار تھا اور صد ہا ہاتھی ساحل کو گھیرے اس طرح کھڑے تھے کہ سکندر کی فوج کو اترتے ہی پامال کر دیں یا سونڈوں سے اچھال کر عدم کو پہنچائیں۔ ایسی حالت میں اس نے عبور دشوار دیکھ کر مقام کر دیا.....پھر ایک اندھیری رات کو جب کہ بادل گرج رہا تھا اور بجلی کوند رہی تھی۔ کچھ پیادے اور چیدہ سوار لے کر اوپر کی طرف چلا.....کہ پورد کے ہزار سوار اس کے سامنے پڑے، مگر جلد مغلوب ہو گئے۔ جب پورد نے سکندر کا دریا سے اترنا سنا تو بہت سا لشکر لے کر خود اس کے مقابلے کو آیا اور تین پہر تک پامردی سے لڑتا رہا۔آخر شکست کھائی اور اسیر ہو کر سکندر کے سامنے لایا گیا۔سکندر نے پوچھا کہ اب آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں ۔ اس نے جواب دیا کہ جو بادشاہ ، بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر پوچھا کہ اور کیا چاہتے ہو؟ کہا میرے پہلے ہی جواب میں سب باتیں نہیں آ گئیں۔ سکندر لڑائی میں اس کی دلاوری اور شجاعت دیکھ کر اور عاقلانہ جواب سن کر ایسا خوش ہوا کہ اس کا ملک اور قرب و جوار کا علاقہ جو فتح کیا، سب اس کو دے دیا۔کہتے ہیں کہ اس معرکے میں پورد کے ہاتھی نے کسی کو اس پاس بھی نہ پھٹکنے دیا اور جتنے تیر اس کے جسم میں لگے تھے، سب اپنی سونڈ سے نکالے۔

شکست کھانے کے باوجود خود کو بادشاہ کہنا اور اس سلوک کا مطالبہ کرنا جو ایک بادشاہ کے شایانِ شان ہوتا ہے، یہ جواب ظاہر کرتا ہے کہ پورس نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ وہ نفسیاتی سطح پر اب بھی غیر مغلوب تھا،مگر یہاں بھی سکندر کی 'عظمت' کو اجاگر کیا گیا ہے کہ اس نے شاہانہ فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورس کو علاقے لوٹا دیے۔اگر ہم اس بیانیے کو پنجاب کی تاریخ کا نمائندہ بیانیہ سمجھیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنا غیر واجب نہیں ہو گا کہ کم از کم ہمارے نصابات میں ہمارے 'ہیرو' وہی قرار دیے گئے ہیں، جنھوں نے ہمیں فتح کیا۔جنھوں نے ان کے خلاف مزاحمت کی، انھیں ہیرو تسلیم نہیں کیا گیا۔مزاحمت کے بیانیے پر فتح کے بیانیے کو ترجیح دی گئی۔دلِ ناتواں کے مقابلے کی کیفیت، نصابی بیانیوں کے قلب میں جگہ نہ حاصل کر سکی۔

شاعری کے حصے پر نظر ڈالیں تو اس میں عام اخلاقی موضوعات پر تین (شرافت، مکڑی اور مکھیاں، عزت)، محنت پر تین (دہنا ہاتھ، پہلے کام بعد میں آرام، کام)، متفرق موضوعات پر آٹھ (صفائی، اپنا گھر، سپوت، زلزلہ، مرغ اسیر اور صیاد، صبح کی چہل پہل، پردیس، میرا جھونپڑا) اور ہندوستانیت پر چھ (سرزمینِ ہند، ہندوستانی بچوں کا گیت، ابر، رونقِ بارش، جگنو، گنگا کا کنارہ) نظمیں شامل ہیں۔

وطنیت اگر ایک نظریہ ہے تو اس کی عملی شکل ہندوستانیت ہے۔اس کتاب کی نظموں میں ہندوستانیت کی تعلیم دینے کا خاص

اہتمام ہے۔جیسا کہ لکھا جا چکا ہے،خود علامہ اقبال ابتدا میں وطنیت اور ہندوستانیت کے قائل تھے،مگر بعد میں انھوں نے وطنیت کی جگہ ملت کا تصور اختیار کرلیا۔یہاں اقبال کی فکر میں اس انقلابی تبدیلی پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔اقبال نے یہاں اپنا مشہور ترانہ: سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، شامل نہیں کیا، تاہم اس ترانے کی روح سے ہم آہنگ نظمیں شامل کی ہیں۔مثلاً وفا کی یہ نظم:

وہ سرزمین میرے ہند کی ہے سن اے وفا جو مرا وطن ہے
وہ جس کو جنت نشان کہتے ہیں ساری دنیا کا جو چمن ہے
اسی کا تاریخی نام ''شائستگی کا گہوارہ'' کہن ہے
ضیائے ماضی سے روئے مستقبل اس کا تاباں کن زمن ہے
نہیں کوئی سرزمین ایسی ،نظیر اس کی کہیں نہیں ہے

ہندوستانیت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین اور اس پر موجود 'سب کچھ' کی محبت و مدح پر ہے۔اس 'سب کچھ' میں یہاں کے ندی نالے، دریا، سمندر، پہاڑ، صحرا، کھیت، درخت، پھل پھول اور یہاں پر رہنے والے سب لوگ، خواہ ان کا تعلق کسی مذہبی، لسانی، نسلی گروہ سے ہو، شامل ہیں۔ان سب متنوع عناصر کی مرکزی تنظیمی قوت، ہندوستان کی ارض ہے۔سب اسی سے پیدا ہوئے اور اسی پر مر مٹنے والے ہیں۔ارض ہندوستان ایک ایسی ''مقدس ماتا اور دیوی'' کا درجہ اختیار کر لیتی ہے،جس پر تمام ہندوستانی اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔یہ تصور 'ہندوستانی بچوں کا گیت' میں خاص طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ہم بھارت ماتا کی سیوا میں تن من دھن کو لگا دیں گے
ہم کیسے جواں ہیں بھارت کے یہ دنیا کو دکھلا دیں گے
ہر دل میں کریں گے اپنا گھر ، ہیں ہم تو محبت کے پیکر
ہر کونے کونے میں جا کر ،ہم پریم کے راگ سنادیں گے
ہم نفس کو اپنے ماریں گے ہم جوش دلوں میں ابھاریں گے
جب جے بھارت کی پکاریں گے ایک شور جہاں میں مچا دیں گے
جب کوئی مسافر پائیں گے ہم اس کے ناز اٹھائیں گے
سب گھر کے چین بھلائیں گے پردیس کو دیس بنائیں گے
کشتی جو بھنور میں پائیں گے طوفان کا جوش مٹا دیں گے
ہم ڈوبیں گے مر جائیں گے پر بیڑا پار لگا دیں گے

کتاب میں ہندوستانیت کا سب سے اہم استعارہ ’’گنگا‘‘ ہے۔جب ہم گنگا پر پوری ایک نظم پڑھتے اوراس کے مندرجات پر غور کرتے ہیں تواس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گنگا استعارہ ہی رہتی ہے علامت نہیں بن پاتی۔یہ اس علامتی وسعت کی حامل نہیں بن پاتی کہ جس میں ارضِ ہندوستان کا تنوع سما سکے۔لہٰذا یہاں ہندوستانیت کا تصور’’جامع اور ہمہ گیر‘‘ نہیں،’’انتخابی اور محدود‘‘ ہے۔یہاں ہندوستانیت شمالی ہندوستان تک محدود ہوتی محسوس ہوتی ہے، اوراس کے بھی ایک حصے تک۔نظم’’گنگا کا کنارہ‘‘ میں صرف ان مناظر کا بیان ہے جن کا گہراتعلق ہندوکلچر اور مذہب سے ہے۔گویا گنگا،گنگا جمنی تہذیب کا کنایہ بھی نہیں بنتی۔کیا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ ہندوستانیت کے ڈسکورس کی تہ میں ہندوکلچر ہی موجود ہے؟

سہانی ہے کس درجہ تاروں کی چھاؤں
ٹہلنے کی خاطر مچلتے ہیں پاؤں
بچھائے ہوئے مرگ چھالے فقیر
لب نہر تڑکے سے ہیں جاے گیر
وہ جوگی بھی دھونی رمائے ہوئے
ہیں پوجا میں آسن جمائے ہوئے
وہ بیلے وہ جوڑے چمکتے ہوئے
وہ کانوں میں مندے لٹکتے ہوئے
وہ گھنٹی بجاتے ہوئے برہمن
ہیں بت خانوں میں کس طرح نعرہ زن
وہ تھالی میں سیندور چندن لیے
کوئی آرہا ہے عجب آن سے
ہر ایک کی نئی دھج نیا ڈھنگ ہے
لب گنگ اس وقت کیا رنگ ہے؟

ہندوستانیت کا تصور بہ ظاہر جس قدر سادہ نظر آتا ہے حقیقتاً اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔یہ پیچیدگی اس وقت نمایاں ہونے لگتی ہے جب اس کی بنیادی فکر کے نتائج پر غور کرتے ہیں۔مثلاً جب ہندوستانیت کی بنیاد ارضِ ہندوستان پر رکھی جاتی ہے توہندوستانی باشندوں کی شناخت کا یہ اصول طے پا جاتا ہے کہ وہ سب ہندوستانی ہیں جو اس دھرتی پر پیدا ہوئے،مگر اس کے ساتھ

ہی یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو باہر سے آئے ، ان کی شناخت کیا ہو؟ یہ سوال ہندوستانیت کی بنیادی فکر کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ سوال، ہندوستان کی تاریخی صورتِ حال کے تناظر میں اس قدر اہم ہے کہ اسے ہندوستانیت پر بحث میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔حتیٰ کہ چھٹی کی نصابی کتاب میں بھی نہیں۔چناں چہ اس سوال کے جواب میں ''شرافت'' کا بیانیہ وضع کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے یہ سوال کا جواب نہیں، اس سوال سے پیدا ہونے والی مشکل اور پیچیدگی سے نکلنے کا راستہ ہے۔یعنی یہ بیانیہ اس تضاد کو حل نہیں کرتا کہ ارضِ ہندوستان کے بیٹوں میں یہاں کے قدیمی باشندوں کے ساتھ نئے باشندوں کو کیوں کر شامل کیا جائے؟بس یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اصول پسندی، شرافت وطنیت پر حاوی ہے کہ ان کا تعلق زمین سے نہیں، انسانی عقلی اخلاقیات سے ہے۔

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بار توطن اٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جس کے پھول ہو تم
کمال کی اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

ہندوستانیت کا ایک مقصود حب الوطنی کی تعلیم دینا بھی تھا۔حیران کن امر محض یہ نہیں ہے کہ نظموں میں بھی حب الوطنی کی مثال کے طور پر ایک یورپی کا قصہ پیش ہوا ہے،سخت الجھا دینے والا امر یہ ہے کہ یہ یورپی ہندوستانیوں کے خلاف جنگ کرتا ہے۔نظم 'سپوت'میں ایک رابرٹ نامی انگریز کی بہادری کا واقعہ منظوم ہوا ہے۔اس قصے میں ماں کے ان جذبات کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے جو وہ محاذِ جنگ پر گئے اپنے بیٹے کے لیے رکھتی ہے۔ہند سے آنے والے کسی شخص سے رابرٹ کی ماں پوچھتی ہے کہ کیا تم رابرٹ کو جانتے ہو،کیا اس نے کوئی پیغام اس کے نام دیا تھا، اس کے لفظ کیا تھے، اس کا کلام کیا تھا؟ جواب میں ہندوستانی کہتا ہے:

ہیولاک کی لڑائی اس نے لڑی ہے ساری
دشمن پہ وار سارے اس کے ہوئے ہیں کاری
دو بار لکھنو پر وہ چڑھ کے خوب اڑا ہے
تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے
کر شکر اس خدا کا جس نے اسے بچایا
ہر معرکے میں اس پر حق کا رہا ہے سایا

اے ماں ! بہادری سے تیرا لڑا ہے بیٹا
اور ہر زباں پر اس کا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جاں کو اس نے رن میں بچا لیا تھا
سرکار میں یہ قصہ سارا لکھا گیا تھا
اس کے صلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے
زاید براں وظیفہ اس کو دیا گیا ہے
ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اس کی تارا رہے درخشاں

نظم کی تیکنیک اس خوبی سے وضع کی گئی ہے کہ ''حب الوطنی'' اپنی آئیڈیالوجیکل وضع کو چھپانے میں کام یاب رہتی ہے۔اوّل نظم کے مافیہ پر ماں کے جذبات کا غلبہ دکھایا گیا ہے ۔جذبات کے اعتبار سے ماں کی کوئی مقامی شناخت نہیں ہوتی۔ماں یورپی ہو یا ہندوستانی،وہ ایک جیسی بے چینی اور فکر مندی اپنے بیٹے کے لیے رکھتی ہے۔اس کے مقابلے میں رابرٹ کی شناخت غیر واضح نہیں۔وہ انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے خلاف بے جگری سے لڑتا ہے؛ان پر تلوار اور توپ چلاتا ہے،اپنے کرنل کی جان بچاتا ہے اور پھر بھی وہ ہندوستانیوں کا ہیرو بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔نظم کی تیکنیک کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ رابرٹ کی بہادری کا سارا بیان ایک ہندوستانی کی زبانی ہے اور ایک ماں کے سامنے ہے۔یہ تیکنیک حب الوطنی کو ایک استعماری آئیڈیالوجی کے طور پر نمایاں ہونے سے باز رکھتی ہے ۔چوں کہ یہ سارا بیان ایک چشم دید گواہی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے یہ باور بھی آتا ہے کہ وہ ہندوستانی خود رابرٹ کے ساتھ لکھنو کے محاذ پر شریک جنگ تھا۔لہٰذا جس جنگ میں خود ہندوستانی اپنے ہم وطنوں کے خلاف صف آرا ہوں ،وہ جنگ ناجائز کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ فقط منطق نہیں، تاریخی صداقت بھی ہے کہ چند ہزار گورے فوجیوں کے ساتھ لاکھوں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے ہی ہم وطنوں سے جنگ کی تھی۔...مگر تیکنیک بہ ہر حال ایک مہین پردہ ہے جو سرسری نظر سے دیکھنے والوں سے کچھ چیزیں مخفی رکھ سکتا ہے۔نظم کے متن ہی میں کچھ باتیں ایسی موجود ہیں جو رابرٹ کی شناخت کی اصل سامنے لاتی ہیں۔تیکنیک یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ رابرٹ کی شناخت ایک بیٹے کی ہے،مگر جب ہم نظم میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ اس کا قصہ سرکار میں لکھا گیا تھا، اس کی جنگی خدمات کے صلے میں اسے تمغہ اور وظیفہ عطا ہوا تھا،تو کھلتا ہے کہ وہ دھرتی کا بیٹا نہیں، سرکار کا کارندہ تھا۔